رجسٹرڈ ایل نمبر ۵۳۴۰

جلد ۵۴ — جون ۶۰ء — عدد ۳

ماہنامہ

ترجمان القرآن

مرتبہ

سید ابوالاعلیٰ مودودی

دفتر رسالہ "ترجمان القرآن"

۵ - اے ذیلدار پارک، اچھرہ - لاہور پاکستان

سالانہ چندہ ۶ روپے — قیمت فی پرچہ ۱۰ آنے

خـــالی صفحـــه

ترجمان القرآن لاہور

فہرست مضامین

عدد ۳	ماہ جون سنہ ۱۹۶۰ء	جلد ۵۴

ابوالخیر مودودی پرنٹر پبلشر نے پاکستان پرنٹنگ پریس میں چھپوا کر دفتر ترجمان القرآن اچھرہ، لاہور سے شائع کیا۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ط

اشارات

اکبر کے دینِ الٰہی کے بعد دوسری تحریک جس میں مسلمانوں کی حیاتِ اجتماعی کو خالص الحاد کی بنیادوں پر استوار کرنے کی کوشش کی گئی وہ آتاترک کی نام نہاد اصلاحی تحریک تھی۔ اس تحریک میں اس امر کا پورا پورا اہتمام کیا گیا کہ ملتِ اسلامیہ کی دینی وحدت کو پارہ پارہ کیا جائے اور مختلف ممالک میں جو مسلمان پھیلے ہوئے ہیں ان کے اندر نیشنلزم کے احساسات ابھار کر انہیں خاکِ وطن کی خاطر جینا اور مرنا سکھایا جائے۔ مسلمانوں کے ملی مراکز جہاں سے انہیں ہر وقت خدا اور اس کے رسول کا پیغام ملتا ہے، انہیں یا تو منہدم کر دیا گیا یا پھر ان کی جگہ میوزیم اور مدارس قائم کیے گئے۔ اسلامی قوانین کو یکسر منسوخ کر کے اُن کی جگہ فرانسیسی کوڈ اور جرمنی اور سوئٹزرلینڈ کے قوانین جاری ہوئے۔ ترکوں کو اپنے ماضی اور اس کی عظیم الشان روایات سے بیگانہ کرنے کے لیے عربی رسم الخط کو بدل دیا گیا۔ حتیٰ کہ عربی میں اذان اور نماز تک بھی ممنوع قرار پائیں۔ مختصراً اس انقلاب کا مقصد یہ تھا کہ اسلامی تہذیب اور تمدن کو یکسر مٹا کر یہاں مغربی تہذیب و ثقافت کو فروغ دیا جائے تاکہ یہ ملک یورپ کے رنگ میں پوری طرح رنگ جائے۔

اس ضمن میں یہ بات بھی ملحوظ خاطر رہے کہ دنیا کے سارے اسلامی ممالک میں اگر کسی ملک میں مغربی تہذیب کے لیے فضا کسی حد تک سازگار ہو سکتی تھی تو وہ صرف ترکی ہی تھا۔ یہ ملک یورپ سے بالکل ملحق ہے اس لیے یورپ کے اثرات اس میں بڑی آسانی کے ساتھ پہنچ سکتے ہیں۔ اس کے علاوہ اس سرزمین میں مغربی تہذیب کا علم اُس شخص نے بلند کیا جسے

کسی حد تک ترکوں کا نجات دہندہ کہا جا سکتا ہے جو مغربی استعمار کے خلاف بڑی بے جگری سے لڑا اور ملک کی آزادی کے لیے بے مثال ایثار اور قربانی پیش کی۔ پھر ترکی میں مغربی تہذیب نے اس وقت قدم رکھا جو اس کے عروج کا زمانہ تھا۔ مغربی تمدن کے علمبردار اپنے اندر نئے نئے عزائم اور ولولے رکھتے تھے۔ خود اس تمدن کی خامیاں پوری طرح نمودار نہ ہوئی تھیں اس لیے ترکوں کا مغربی افکار و نظریات سے مرعوب و مغلوب ہو جانا بالکل فطری امر تھا۔

اس تحریک کو ملک میں کس حد تک کامیابی نصیب ہوئی اُس کا ایک ہلکا سا اندازہ اُن اخبارات و رسائل کی اطلاعات سے کیا جا سکتا ہے جو مغربی اقدار کے سب سے بڑے حامی ہیں اور انہیں دنیا میں کامیاب و کامران دیکھنے کے نہ صرف آرزومند ہیں بلکہ اس راہ میں جدوجہد بھی کر رہے ہیں۔ تین ماہ قبل مشہور رسالہ ٹائمز میں اسی موضوع پر ایک طویل مضمون شائع ہوا تھا جس کے چند اقتباسات ذیل میں درج کیے جاتے ہیں:

"مذہب کا احیاء دوسرے ممالک میں ممکن ہے کہ ایک علمی بحث کا موضوع ہو لیکن ترکی میں یہ صورتِ حال ہرگز نہیں۔ یہاں اس کی سیاسی اہمیت ہے۔ ۱۹۲۰ء میں جب کمال اتاترک نے ترکی میں انقلاب کی بنیاد رکھی تو اس کا مقصد یہ تھا کہ اسلام کو اجتماعی زندگی سے خارج کر کے اسے غیر مذہبی بنیادوں پر استوار کیا جائے۔ اس لیے ترکی میں اسلام کا احیاء بڑے دُور رس نتائج کا حامل ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ اتاترک نے ملک کی ترقی کے لیے جو اصلاحات تجویز کی تھیں یا جو منصوبے تیار کیے تھے وہ دریا برد کر دیئے جائیں۔ یہ تمثیل اگرچہ مقصد کو پوری طرح واضح نہیں کرتی لیکن اس وقت مذہب کو زندہ کرنے کے لیے ترکی میں جو کچھ ہو رہا ہے وہ نوعیت کے اعتبار سے انگلستان کی اُس تحریک کی طرح ہو گا جو پارلیمنٹ کی برتری کے بجائے بادشاہ کی برتری کو بحال کرنے کے لیے

شروع کی جائے۔ اتاترک کو اپنے عزائم میں جو کامیابی نصیب ہوئی اس میں اُس کے ذاتی اثر رسوخ اور ترکی قومیت کے جوش و ولولہ کا بڑا عمل دخل تھا اور ان دونوں چیزوں نے مذہب کو وقتی طور پر شکست دے دی، لیکن جونہی اتاترک نظروں سے اوجھل ہوا اُسی وقت مذہب کا احیاء شروع ہوا۔ آج پھر ابتدائی اور ثانوی سکولوں میں مذہبی تعلیم لازمی ہوگئی ہے۔ ریڈیو پر قرآن مجید کی باقاعدہ تلاوت ہوتی ہے۔ ائمہ کی تعلیم کے لیے جگہ جگہ مدارس کھولے جا رہے ہیں۔ انقرہ یونیورسٹی میں دینیات کا شعبہ قائم کیا گیا ہے۔ مذہبی کتب جو اتاترک کے عہد میں بالکل ناپید تھیں اب بڑی تیزی کے ساتھ شائع کی جا رہی ہیں۔ رمضان کے مہینے میں مسجدوں میں بے حد رونق ہوتی ہے۔ انقرہ کے عین وسط میں ایک اسلامی مرکز قائم کرنے کی تجویز ہے جس میں ایک عظیم الشان مسجد، ایک بہت بڑا مدرسہ اور ایک وسیع دار المطالعہ قائم کیے جائیں گے۔ اس مرکز کے علاوہ ۱۹۵۰ء سے آج تک ترکی میں پانچ ہزار نئی مساجد تعمیر ہوئی ہیں ان میں پچاس صرف انقرہ میں ہیں۔ حکومت ان مساجد کو جو امداد دے رہی ہے اُس کا پوری طرح اندازہ نہیں کیا جا سکتا مگر ایک بات وثوق سے کہی جا سکتی ہے کہ وہ اچھی خاصی رقم ہے۔ ائمہ کی تعلیم و تربیت کے لیے جو مدارس قائم ہوتے ہیں اُن کی تعداد میں بھی بڑی سرعت کے ساتھ اضافہ ہوا ہے۔ ۱۹۵۱ء میں اس قسم کے مدارس صرف سات تھے اور اب اُن کی تعداد انیس تک پہنچ گئی ہے۔ ان مدارس سے ہر سال ساڑھے چار ہزار نوجوان فارغ التحصیل ہو کر نکلتے ہیں۔ ان اداروں میں زیادہ تر عربی، فارسی اور دینیات کی تعلیم دی جاتی ہے۔

مغربی اقوام میں ترکوں کی اس مذہبی بیداری کا جو ردِ عمل ہو رہا ہے اُس کو بھی ذرا ملاحظہ فرمائیں۔

"بہت سے ترک مفکرین اس صورتِ حال پر سخت پریشان ہیں۔ پارلیمنٹ میں اس موضوع پر جو مباحثے ہوتے ہیں اُس میں حزبِ اختلاف نے برسرِ اقتدار پارٹی پر ہمیشہ مذہب کی حمایت اور تعاون کا الزام لگایا ہے۔ موجودہ حکومت کے قیام کے بعد تمام وہ مذہبی عناصر جو اتاترک کے عہد میں غائب ہو گئے تھے اب پھر نمودار ہو رہے ہیں۔ لیکن اس معاملہ میں لطف کی بات یہ ہے کہ یہ حزبِ اختلاف جو اتاترک کی اصلاحات پر دل وجان سے فریفتہ ہے وہ بھی مذہب کی کھل کر مخالفت نہیں کر سکتی کیونکہ اسے اس بات کا پورا یقین ہے کہ ایسا کرنے سے آنے والے انتخابات میں وہ زیادہ ووٹ حاصل نہیں کر سکیگی۔ ترکی جمہوریہ ہے اور عوام مذہب کا احیاء چاہتے ہیں۔ اتاترک نے لوگوں کی رہنمائی کی تھی لیکن آج عوام اپنے سربراہوں کی قیادت فرما رہے ہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اتاترک کی اصلاحات کو ابھی تک پوری طرح کالعدم نہیں کیا گیا لیکن ایک ایسے ملک میں جہاں اتاترک کو قومی ہیرو مانا جاتا ہے اور جس کی تعریف و توصیف میں لوگ رطب اللسان ہوں وہاں مذہب کا احیاء بہت بڑی اہمیت رکھتا ہے۔

کیا اتاترک کے پیشِ نظر صرف ریاست اور مذہب کو ایک دوسرے سے الگ کرنا تھا یا اس کے سامنے اس سے بلند تر کوئی مقصد موجود تھا یعنی مذہب کا خاتمہ۔ اگرچہ اب یہ بات کہنا ایک فیشن سا بن گیا ہے کہ اتاترک مذہب کا مخالف نہیں تھا لیکن امرِ واقعہ یہ ہے کہ ترکی کا یہ ہیرو اس بات پر پختہ یقین رکھتا تھا کہ ترکوں کو اُس وقت تک مغربی اقدار کا پوری طرح پرستار نہیں بنایا جا سکتا جب تک کہ اسلام کی گرفت اُن پر سے ڈھیلی نہ ہو جاتے۔" (ٹائمز)

ترکی میں جو فوجی انقلاب ہوا ہے اُس کے بارے میں مغربی حلقوں میں جس مسرت اور

شادمانی کا اظہار کیا جارہا ہے اُس کی وجہ یہ نہیں کہ اہلِ مغرب یہ سمجھتے ہیں کہ ترکی میں اس انقلاب سے ایک مضبوط قومی حکومت کا قیام ممکن ہوگا اور یہ حکومت جمہوریت کو ملک میں بحال کرنے میں زیادہ کامیاب ہوگی بلکہ اس خوشی کی اصل وجہ یہی ہے کہ اسلام کے احیاء کے لیے جو کوششیں کی جارہی ہیں انہیں اب زیادہ قوت سے دبایا جاسکے گا۔ ٹائمز نے اس انقلاب پر جو تاثر بیان کیا ہے وہ گہرے غور و فکر کا محتاج ہے:

"ترکی کسی انقلاب کی آغوش میں نہیں۔ انقلاب تو اس پر ۳۰ سال پیشتر اتاترک کے عہد میں آچکا تھا۔ فوج اس وقت جو کچھ کر رہی ہے وہ صرف یہ کہ عدنان مندریس کے دورِ اقتدار میں اسلام کا جو احیاء ہوا ہے اور اس طرح قوم اتاترک کے بتلائے ہوئے اصولوں سے جس حد تک ہٹی ہے اسے اُن کی طرف پھر لوٹا دیا جائے۔ ترکی میں آج بھی ایک ہی لیڈر ہے یعنی اتاترک، اور اس حقیقت کو فوجی انقلاب کے سب سے بڑے سربراہ نے اس بیان میں تسلیم کیا ہے جس میں اُس نے نہایت واضح الفاظ میں یہ کہا ہے کہ نئے دستور میں جسے یونیورسٹی کے اساتذہ ترتیب دے رہے ہیں ایک دفعہ یہ بھی ہوگی کہ مذہب کو سیاسی مقاصد کے حصول کا ذریعہ نہ بنایا جائے۔"

ٹائمز کے اس نقطۂ نظر کی مشہور اخبار آبزرور نے بھی تائید کی ہے۔ وہ لکھتا ہے:

"حریت پسند ترک اس بات سے خائف تھے کہ ملک میں مذہبی بیداری عام ہو رہی ہے۔ مندریس کیا بذات خود کوئی مذہبی آدمی ہے یہ ایک الگ مسئلہ ہے۔ ہمارے لیے جو چیز اہمیت رکھتی ہے وہ یہ ہے کہ ترکوں کی اکثریت کے لیے جو ابھی تک اسلام سے وابستہ ہے۔ عدنان اور اُس کے رفقاء اسلام کے حامی اور علمبردار تھے اور عصمت انونو اور اُس کی

پارٹی اتا ترک کے فدائی۔

ممکن ہے ایک سطح بین آنکھ کے لیے اکبر کے دینِ الٰہی اور اتا ترک کی اصلاحات کے خلاف جو ردِ عمل ہوا ہے وہ کوئی اتفاقی حادثہ ہو لیکن وہ شخص جس نے ان حالات و واقعات پر ذرا گہرائی میں اتر کر مطالعہ کیا ہے وہ اسے کبھی بھی بخت و اتفاق سے تعبیر نہیں کر سکتا۔ ان اسلام دشمن تحریکات کی اپنی فطرت اور اپنے مزاج میں تباہی و بربادی کے پورے پورے سامان موجود تھے۔ تاریخ نے اُن کے بارے میں جو فیصلہ کیا ہے وہ بالکل صحیح اور قانونِ قدرت کے عین مطابق ہے۔ یہ تحریکات وقتی اور ہنگامی حالات کے تحت ابھری تھیں۔ ان کے پیش نظر صرف وقتی مسائل تھے، مگر بدقسمتی سے ان تحریکات کے علمبرداروں نے انہیں مستقل اور پائیدار سمجھا اور جب یہ دیکھا کہ ان کا مزاج اسلام سے میل نہیں کھاتا تو دین کے اندر تحریف شروع کر دی۔ کچھ وقت کے لیے تو یہ جادو چل گیا، لیکن تھوڑی مدت گزرنے کے بعد جب حقیقت بے نقاب ہو کر سامنے آئی تو پھر لوگوں کی آنکھیں کھلیں اور انہیں معلوم ہُوا کہ ان کے ساتھ برسرِ اقتدار گروہ نے نہایت شرمناک کھیل کھیلا ہے۔ اس احساس کے بعد اُن میں ردِّ عمل کا پیدا ہو جانا بالکل فطری امر تھا۔

ان صفحات میں اتنی گنجائش نہیں کہ اس موضوع پر کوئی تفصیلی بحث کی جائے۔ یہاں اس حقیقت کو صرف ایک مثال سے واضح کیا جاتا ہے۔ ایک ان پڑھ سے ان پڑھ مسلمان بھی اسلامی قومیت کے بارے میں اس قدر تو ضرور جانتا ہے کہ اسلام میں قومیت کا اصل اصول نہ اشتراکِ زبان ہے نہ اشتراکِ وطن، نہ اشتراکِ اغراضِ اقتصادی۔ بلکہ ہم مسلمان ہونے کی حیثیت سے اُس وسیع برادری میں جو جناب رسالتمآب صلی اللہ علیہ وسلم نے قائم فرمائی تھی اس لیے شریک ہیں کہ مظاہر کائنات کے متعلق ہم سب کے معتقدات

کا سرچشمہ ایک ہے اور جو تاریخی روایات ہم سب کو ترکہ میں ملی ہیں وہ بھی ہم سب کے لیے یکساں ہیں اسلام تمام مادی قیود سے بیزاری ظاہر کرتا ہے اور اس کی قومیت کا دارومدار ایک خاص تہذیبی تصور پر ہے۔ اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ خاک و خون کے رشتے ایک مسلمان کے لیے کوئی اہمیت نہیں رکھتے یا وہ ان علائق کا دشمن ہے بلکہ اس کا مقصد صرف یہ ہے کہ ایک مسلمان کو دوسرے مسلمان کے ساتھ وابستہ اور جوڑنے والی چیز وطن یا برادری نہیں بلکہ دین ہے اور دین ہی اس کے اندر زندہ رہنے کی تڑپ اور بڑھنے اور پھلنے پھولنے کے احساسات پیدا کرتا ہے اور یہ چیز ایک مسلمان کے دل و دماغ میں پوری طرح جاگزیں ہو چکی ہے۔

اتاترک نے جس وقت ہوش سنبھالا اُس وقت چونکہ نیشنلزم کا زور تھا اس لیے اس نے یہ سمجھا کہ ترکوں کی نجات کا واحد راستہ بھی اسی مسلک کی پیروی میں ہے۔ اس نے وقتی جوش میں آکر خلافت کی بخیا چاک کر دی اور قومیت کی بنیاد وطن کو قرار دیا۔ چونکہ یہ نظریہ اسلام کے مزاج کے یکسر منافی ہے اس بنا پر اس "ترکِ ناداں" کو اسلام سے بغاوت کرنا پڑی۔ کچھ لوگ جن کی نگاہیں وقتی مسائل کے خم و پیچ میں ہمیشہ الجھی رہتی ہیں اور جو کسی مسئلہ کو بالغ نظری سے دیکھنے کے عادی نہیں ہوتے انہوں نے اس اقدام پر بڑی مسرت کا اظہار کیا۔ مغربی حلقوں میں بھی اس تبدیلی کا بڑے جوش و خروش سے خیر مقدم ہوا کہ چلو اسلامی برادری سے ایک قوم تو کٹی لیکن اس انقلاب پر ابھی چند سال ہی گزرے تھے کہ خود یورپ کے اندر اس نیشنلزم کے خلاف بغاوت کا جذبہ نمودار ہونے لگا۔ زمان و مکان کی تسخیر نے دنیا کے مختلف گوشوں کو ایک دوسرے کے اس قدر قریب کر دیا ہے کہ اب انہیں محض وطن کی بنیاد پر زندہ رہنا مشکل نظر آتا ہے۔ اس صورتِ حال کے بدل جانے سے ترکوں کے اندر بالکل قدرتی طور پر یہ احساس پرورش پانے لگا ہے کہ ان کے رہنما جنہوں نے انہیں امتِ مسلمہ سے الگ کیا ہے کوئی صاحب نظر اور عافیت اندیش لوگ نہ تھے بلکہ بڑے کم نظر تھے جنہوں نے انہیں بڑے غلط راستے پر

ڈال دیا۔ جب لوگوں کے اندر یہ احساس بڑھنے لگے تو لازمی طور پر اُن میں رہنماؤں کے متعلق ایک عام بے اعتمادی سی پیدا ہو جاتی ہے اور وہ ملّت کے ان "خیر خواہوں" کے سارے کارناموں کو نفرت کی نگاہ سے دیکھنا شروع کر دیتے ہیں۔ ترکی میں بھی یہی کچھ ہوا۔ اتاترک نے ترکوں کے اندر نیشنلزم کے احساسات اُبھار کر ایک اتنی بڑی حماقت کی ہے کہ مسلمان تو کیا غیر مسلموں نے بھی اُس کی اس ناعاقبت اندیشانہ روش پر لعنت کہی ہے۔ اس سلسلہ میں فلسفۂ تاریخ کے مشہور مفکر پروفیسر آرنلڈ ٹائن بی کے تاثرات پڑھنے کے قابل ہیں۔ وہ اپنی تصنیف "دنیا اور مغرب" کے دوسرے باب میں اتاترک کی اس حماقت کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھتا ہے:

"ترک اور بہت سی دوسری مسلمان قوموں نے نیشنلزم کو اپنایا ہے۔ اس مرحلہ پر ہم اپنے آپ سے ایک سوال کرتے ہیں کہ مغرب کے اس تنگ دلانہ اور متعصبانہ نقطۂ نظر کو جب ایک ایسی وسیع المشرب قوم اختیار کرے جس کی قومی روایات نے اسے یہ سبق دیا ہے کہ مسلمان خواہ کسی نسل سے تعلق رکھتا ہو، خواہ کوئی زبان بولتا ہو، خواہ کسی خطۂ ارضی میں آباد ہو وہ ایک دوسرے کا بھائی ہے، تو اس کا حشر کیا ہوگا۔ اس جدید دور میں جس میں سائنس کے انکشافات نے زمان و مکان کے فرق کو قریب قریب مٹا دیا ہے، جس میں اب مغربی تصورات اور اشتراکی نظریات ایک دوسرے سے برسرِ پیکار ہیں اور رنگ و نسل یا زبان کی بنیاد پر نہیں بلکہ محض آئیڈیالوجی کی اساس پر قومیتوں کی تشکیل کی جا رہی ہے، اسلام کا نظریۂ اخوت اور اس کی روایات عہدِ حاضر کے تمدنی تقاضوں کو مغربی قومیتوں کی بہ نسبت بہتر طور پر پورا کر سکتی ہیں۔ نئے حالات میں جس میں دنیائے مغرب چالیس چھوٹی چھوٹی آزاد قوموں میں منقسم ہے اس بات کا ہر وقت خدشہ موجود رہتا ہے کہ کہیں یہ آپس میں لڑ کر ختم نہ ہو جائیں۔ یہ بجا طور پر توقع کی جا سکتی ہے کہ دنیائے اسلام میں مغرب کا لایا ہوا قوم پرستی کا

بہ حیثیتِ اسلامی روایات کی قوت و طاقت سے ختم ہو جائے گا یا کم از کم ترقی نہ پائے گا۔ اس ایٹمی دور میں انسانیت کی نجات کے لیے انسانی اتحاد جتنا آج ضروری ہے اس سے پیشتر کبھی اس کی ضرورت اتنی شدت سے محسوس نہ ہوتی تھی۔"

پروفیسر صاحب نے بڑی صراحت کے ساتھ یہ کہا ہے کہ دوسرے مسلمان ممالک اگر ترکی کی پیروی کریں گے تو خود اپنی تباہی و بربادی کا موجب بنیں گے۔ انہوں نے اہلِ پاکستان کو اس حرکت پر سخت متنبہ کیا ہے۔ وہ فرماتے ہیں:

"آپ اہلِ پاکستان کو ایک قومی ریاست میں پورا پورا اختیار حاصل ہوتا ہے۔ ان کی یہ ریاست بڑی وسیع و عریض ہے اور بہت زیادہ گنجان آباد۔ ہندوستانی مسلمانوں کو آزادی کی قیمت ترکوں اور مصریوں کے مقابلے میں کہیں زیادہ ادا کرنی پڑی۔ تجربے اور مشاہدے نے انہیں مغربی نیشنلزم کی قیمت اور اس کے عیوب سے پوری طرح آشنا کر دیا ہے۔ پاکستان اور ترکی کے رہنے والے سیاسی میدان میں اب ایسے سبق حاصل کر رہے ہیں جو نہ صرف مسلمانوں کے لیے مفید اور کارآمد ہوں گے بلکہ ایک دنیا ان سے پوری طرح فائدہ اٹھا سکے گی۔"

اقتباسات ذرا طویل ہو گئے ہیں لیکن ان میں فاضل مصنف نے بڑی دیدہ وری سے مسلم قوم کی اس حماقت کا جائزہ لیا ہے جو اس نے مغربی نیشنلزم کو اختیار کرنے کے سلسلہ میں کی ہے۔ یہ احساسات اُس شخص کے ہیں جو مغرب کا پرستار ہے لیکن اس کے باوجود وہ اس حقیقت کو اچھی طرح جانتا ہے کہ دنیا کی کوئی قوم جس کی اپنی تہذیب ہو، جو اپنی روایات رکھتی ہو، جو ایک متعین اسلوبِ حیات کی علمبردار ہو اور جو انفرادی اور

اجتماعی زندگی میں اپنی مستقل اقتدار رکھنے کا دعوےٰ کرے وہ دوسری اقوام کی نقالی کر کے کبھی بھی دنیا میں پنپ نہیں سکتی۔ وہ ایک ایک قدم پر ٹھوکر کھاتی ہے اور ہر گام پر حادثات کا شکار ہوتی ہے۔ اس کے اندر نہ صرف یاس و قنوطیت کے جراثیم پرورش پاتے ہیں۔ بلکہ اپنے آپ پر اعتماد بھی ختم ہو جاتا ہے۔

مصر ہو یا ایران، ٹرکی ہو یا پاکستان، ٹیونس ہو یا انڈونیشیا، ان سب کو اس وقت ایک ہی مسئلہ درپیش ہے کہ ان کے ہاں ایک مختصر سا طبقہ جسے بدقسمتی سے سیاسی اقتدار بھی حاصل ہے، وہ مسلمانوں کی عظیم اکثریت کو مغرب پرستی کی راہ پر ڈالنا چاہتا ہے لیکن قوم اس پر آمادہ نہیں ہوتی۔ برسر اقتدار گروہ جبر سے، قوت و طاقت سے اسے چند قدم ہانکتا ہے لیکن جلد ہی جب قوم کو اس راہ کے خطرات نظر آنے شروع ہوتے ہیں تو وہ برگشتہ ہو کر اپنی اصل منزل کی طرف لوٹنے کے لیے جدوجہد کرتی ہے۔ یہ مغرب زدہ طبقہ پولیس اور فوج کی مدد سے اس کا راستہ روکتا ہے اور اس طرح آپس ہی میں کشمکش شروع ہو جاتی ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ امتِ مسلمہ کی قوتیں اور صلاحیتیں کسی تعمیری اور مثبت کام پر صرف ہونے کی بجائے باہمی آویزش میں صرف ہو رہی ہیں۔ ہمارے نزدیک ملتِ بیضا کا اصلی روگ یہی ہے اور جب تک اس کا پوری طرح علاج نہیں کیا جاتا وہ ایک قدم بھی آگے کی طرف نہیں اٹھا سکتی۔

اس مقام پر ہم اس امر کی صراحت کر دینا بھی ضروری سمجھتے ہیں کہ مسلمانوں کا یہ مغرب زدہ طبقہ اسلام کے خلاف کھلم کھلا کارروائی نہیں کرتا بلکہ اسلام کو مٹانے کے لیے جو سازشیں بھی کی جاتی ہیں وہ سب اسلام کے نام پر ہی ہوتی ہیں اور اسی طریقہ کو تجربہ سے زیادہ مفید اور کارآمد پایا گیا ہے۔ یہ طبقہ اپنی تقریروں اور تحریروں میں، اپنے آپ کو اسلام کا سچا فدائی

اور خیر خواہ ظاہر کرتا ہے لیکن جس اسلام کی محبت کا وہ اس قدر دم بھرتا ہے اُس کی جھلک نہ تو خود اُس کی اپنی زندگی کے کسی گوشے میں نظر آتی ہے اور نہ ہی اجتماعی زندگی کے لیے جو منصوبے تیار کیے جاتے ہیں اُن میں اس کا کوئی نام و نشان ملتا ہے۔ یہ صورت حال قومی زندگی کے لیے حد درجہ خطرناک ہے۔ اس سے قوم کے اندر ذہنی خلفشار پیدا ہوتا ہے جس سے آہستہ آہستہ اُس کی ساری قوتیں ختم ہو جاتی ہیں۔ اگر یہ لوگ اسلام سے کھل کر انحراف کریں تو معاملہ اتنا پیچیدہ اور تشویشناک نہ ہو لیکن ان حضرات کا یہ طرزِ عمل امتِ مسلمہ کے لیے ایک بہت بڑی مصیبت بن گیا ہے۔

آپ کسی اسلامی ملک کے برسرِ اقتدار طبقے کے اقوال اور افکار و اعمال کا جائزہ لیں تو آپ کو اس ذہنی انتشار کے بڑے نادر سے نادر نمونے ملیں گے۔ ایک طرف اسلام کی مدح ستائش ہو رہی ہو گی، اسے دنیاوی اور اُخروی زندگی کے لیے واحد ذریعۂ نجات بتایا جا رہا ہو گا لیکن دوسری طرف اسلام جن چیزوں کو دنیا سے مٹانے کے لیے آیا ہے، اُن کی بھی دل و جان سے تائید ہوتی ہو گی اور معاملہ صرف لفظی تائید تک ہی محدود نہیں رہتا بلکہ ملک میں انہیں فروغ دینے کے لیے ہر ممکن کوشش بھی ہوتی ہے۔ کونسا ایسا مسلمان ہے جو اس حقیقت کو نہیں جانتا کہ اسلام نے رقص و سرود کو حرام ٹھہرایا ہے اور یہ چیزیں اسلام کے مزاج کے منافی ہیں۔ جو لوگ ان کے رسیا ہوتے ہیں۔ ان میں عملی قوتیں ناپید ہوتی ہیں اور دینی نقطۂ نظر سے وہ کسی کام کے نہیں رہتے۔ امتِ مسلمہ کے اندر ان فواحش کا پھیلنا ایک بہت بڑے خطرہ کی علامت ہے۔ یہ مرغ بادنما ہے جو ایک خطرناک طوفان کا پتہ دیتا ہے۔ یہ وہ حقائق ہیں جن سے ہم پوری طرح واقف ہیں لیکن انہیں جانتے ہوئے آج دنیا کے ہر مسلمان ملک میں انہیں ترقی دینے کے لیے پوری پوری کوششیں کی جا رہی ہیں اور ان میں پیش پیش وہ لوگ ہیں جن کے ہاتھ میں ملک کی زمامِ کار ہے۔ اور پھر لطف کی بات یہ ہے کہ ان فواحش

کے پھیلانے کو بھی اسلام ہی کی خدمت کا نام دیا جاتا ہے۔ اس اندوہناک صورت حال میں ایک عام مسلمان کا دل و دماغ جس حد تک پریشان ہوتا ہے اُس کا اندازہ وہ شخص بڑی آسانی کے ساتھ کر سکتا ہے جس نے کبھی بھی عام لوگوں سے مل جل کر اُن کے تاثرات معلوم کرنے کی کوشش کی ہے۔ آپ کسی بس سٹاپ پر کھڑے ہو جائیں۔ کسی گاڑی کے ڈبے میں بیٹھ جائیں، کسی اجتماع میں شریک ہوں تو آپ لوگوں کو اسی موضوع پر اظہار خیال کرتے ہوئے پائیں گے۔ وہ خواہ اسلام پر پوری طرح عمل کرنے والے نہ ہوں لیکن اُن کے دل و دماغ، اور احساس و وجدان میں اسلام کا وہی تصور رہتا ہے جو انہیں حضور سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم اور ان کے جلیل القدر صحابہ رضی اللہ عنہم سے ملا ہے۔ جب وہ اس تصور کی روشنی میں "جدید اسلام" کو دیکھتے ہیں تو وہ سخت مضطرب ہو کر پکار اٹھتے ہیں:

"این نقشِ دیگر است"

مگر ان کے سربراہ انہیں ہر ممکن طریق سے یہ باور کراتے ہیں کہ اسلام درحقیقت یہی ہے، ملّا نے اپنی ذاتی اغراض کے تحت اسے تم سے چھپا رکھا تھا۔ یہ بات کبھی انہیں مطمئن نہیں کر سکتی۔ وہ یہ سمجھ نہیں پاتے کہ آخر رقص و سرود اگر فی الواقع دین کا ایک لازمی جزو ہی ہے تو اسے آج تک اخفا میں رکھنے کی کیا مصلحت تھی اور اس سے ملّا بے چارے کو کونسے فوائد حاصل ہوتے ہیں۔

اس مغرب زدہ طبقہ کی پوری توجہ عرصہ دراز سے صرف اسی ایک نقطۂ نظر پر مرکوز چلی آرہی ہے کہ کسی طرح مغربی تہذیب اور اسلامی تہذیب کے درمیان جو حجابات موجود ہیں انہیں ختم کر دیا جائے۔ یہ لوگ درحقیقت مغربی اقدارِ حیات کے ہی پرستار ہیں لیکن چونکہ ان کی براہِ راست تبلیغ کرنے سے اُن کا اقتدار خطرے میں پڑتا ہے اس لیے وہ انہیں اسلام کا نام لے کر پھیلانا چاہتے ہیں اور جب انہیں کوئی یہ کہتا ہے کہ یہ چیزیں جنہیں تم اسلام کہہ کر

ہو اسلام میں موجود نہیں تو وہ فوراً یہ کہنا شروع کر دیتے ہیں کہ اسلام میں تو بڑی وسعت ہے تم نے اس کا دائرہ خواہ مخواہ تنگ کر دیا ہے۔ ان حضرات کو اسلام کے کسی ایسے جزو پر اعتماد نہیں جس کی تائید مغربی فکر سے نہ ہو سکے۔ اسلام ان کے نزدیک ایک بے بس غلام ہے جس سے جتنا چاہا کام نکال لیا اور جسے جہاں چاہا بڑی بے تکلفی کے ساتھ استعمال کیا۔ اس طرز فکر کو آپ مسلمانوں کی پوری مغرب زدہ لیڈرشپ کے اندر بڑی آسانی کے ساتھ دیکھ سکتے ہیں۔ یہاں ہم صرف اُس کی ایک مثال پیش کرتے ہیں۔

جنرل ناصر جب اپریل میں پاکستان تشریف لائے تو انہوں نے اسلامی تہذیب اور اس کی روایات کو بڑے اچھے انداز میں سراہا لیکن انہیں خود اسلام پر جو اعتماد ہے اُس کا اندازہ اُس جواب سے کیا جا سکتا ہے جو اُن سے اسلامی بلاک کے سلسلہ میں پوچھا گیا۔ ایک اخباری نمائندہ نے اُن سے کہا کہ کیا آپ ایک مسلم بلاک کی تشکیل کے حق میں ہیں؟ اس پر انہوں نے فرمایا کہ مذہب کو قومی یا بین الاقوامی سیاست کی بنیاد نہیں بنایا سکتا۔ البتہ وہ اس کے حق میں ضرور ہیں کہ مسلم ممالک کے درمیان زیادہ سے زیادہ رابطہ ہو کیونکہ وہ ایک دوسرے کے ساتھ روحانی رشتے میں بندھے ہوئے ہیں۔

یہ ہے اس قسم کے حضرات کا اُس دین پر اعتماد جو زندگی کے سارے گوشوں کا احاطہ کرتا ہے، جو فکر و نظر کی انتہائی بلندیوں سے لیکر افعال و اعمال کی معمولی سے معمولی جزئیات تک ہماری نہ صرف رہنمائی کرتا ہے بلکہ انہیں ایک خاص سانچے میں ڈھالتا ہے، اور اس طرح ایک مخصوص تہذیب و تمدن کی عمارت تعمیر ہوتی ہے۔

دنیا کا ہر تمدن جو اپنے پیش نظر ایک انقلابی پروگرام رکھتا ہو وہ اس نیم دلانہ وابستگی کو کبھی بھی گوارا نہیں کرتا۔ اس کے اندر تخلیقی قوت اُسی وقت تک موجود رہتی ہے جب تک اُس کی اپنی روح اُس کے مختلف شعبوں کے اندر جاری و ساری رہے اور جب بھی کسی تمدن میں باہر

ایسے عناصر شامل کیے گئے جو اُس کے مزاج سے مناسبت نہ رکھتے تھے اُس وقت وہ تمدن تباہ ہؤا۔ اس سلسلہ میں یوں تو بہت سے شواہد موجود ہیں لیکن یہاں ہم صرف دو مفکرین کی آراء پیش کر کے بات ختم کرتے ہیں:

"ہر تہذیب اپنے آپ میں ایک وحدت ہوتی ہے، اس کا آرٹ، مذہب، طرزِ رہائش، معاشی اور صنعتی ترقی، یہ سب شعبے ایک دوسرے سے منسلک ہوتے ہیں مجھے اس امر میں شک ہے کہ کوئی قوم بھی حسبِ منشا تمدن کے عناصر کے اندر انتخاب کرنے میں کامیابی حاصل کر سکتی ہے۔ مثال کے طور پر کیا اہلِ مشرق یہ کہہ سکتے ہیں: ہم مغرب سے صرف اس کے بڑے بڑے جہاز، اس کے کارخانے اور طبی ایجادات تو لیں گے لیکن اُس ذہنی انتشار، اُس برق رفتاری اور اُس تمدنی خلفشار سے بچ نکلیں گے جو مغربی تہذیب کے لازمی تقاضے ہیں۔" (لوئس ڈکنسن)

حقیقت یہ ہے تہذیبِ مختلف اجزا میں منقسم نہیں ہو سکتی۔ مثال کے طور پر دنیائے مغرب کو دوسری دنیا پر جنگی میدان میں جو برتری حاصل ہے اُس کی وجہ وہ اسلحہ اور عسکری تربیت نہیں، جن سے اہلِ مغرب واقف ہیں اور نہ ہی محض صنعتی ترقی کو اس کی علت قرار دیا جا سکتا ہے اسے پوری طرح سمجھنے کے لیے ہمیں مغربی سوسائٹی کی روح کا مطالعہ کرنا چاہیے۔ اہلِ مغرب کی جنگی تدابیر اُن کے تہذیبی مظاہر ہی کا حصہ ہیں۔ لہٰذا ایک ایسی سوسائٹی جس نے لڑنے کے مغربی طریقوں کو مغربی تہذیب اپنائے بغیر اختیار کرنے کی کوشش کی ہے وہ سخت ناکام ہے۔۔۔ (آرنلڈ ٹائن بی)

معذرت پچھلی ترجمہ ماہ اپریل ۶۰ء کے پرچہ پر غلطی سے مئی ۶۰ء طبع ہو گیا تھا۔ مئی ۶۰ء کے پرچہ میں بھی اس کی تصحیح میں فروگزاشت ہو گئی۔ لہٰذا خریدار اور ایجنٹ حضرات درست فرمالیں۔ (مینجر)

تفہیم القرآن

القصص

(۴)

جن لوگوں کو اس سے پہلے ہم نے کتاب دی تھی وہ اِس (قرآن) پر ایمان لاتے ہیں۔[۵۵]

۵۵ اس سے یہ مراد نہیں ہے کہ تمام اہلِ کتاب (یہودی اور عیسائی) اس پر ایمان لاتے ہیں۔ بلکہ یہ اشارہ دراصل اُس واقعہ کی طرف ہے جو اِس سورہ کے نزول کے زمانہ میں پیش آیا تھا، اور اس سے اہلِ مکہ کو شرم دلانی مقصود ہے کہ تم اپنے گھر آئی ہوئی نعمت کو ٹھکرا رہے ہو حالانکہ دُور دُور کے لوگ اس کی خبر سن کر آ رہے ہیں اور اُس کی قدر پہچان کر اس سے فائدہ اٹھا رہے ہیں۔

اس واقعہ کو ابن ہشام اور بیہقی وغیرہ نے محمد بن اسحاق کے حوالہ سے اس طرح روایت کیا ہے کہ ہجرتِ حبشہ کے بعد جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت اور دعوت کی خبریں حبش کے ملک میں پھیلیں تو وہاں سے ۲۰ کے قریب عیسائیوں کا ایک وفد تحقیقِ حال کے لیے مکہ معظمہ آیا اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے مسجد حرام میں ملا۔ قریش کے بہت سے لوگ بھی یہ ماجرا دیکھ کر گرد وپیش کھڑے ہو گئے۔ وفد کے لوگوں نے حضور سے کچھ سوالات کیے جن کا آپؐ نے جواب دیا پھر آپؐ نے ان کو اسلام کی طرف دعوت دی اور قرآن مجید کی آیات ان کے سامنے پڑھیں۔ قرآن سُن کر ان کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے، اور انہوں نے اس کے کلام اللہ ہونے کی تصدیق کی اور حضورؐ پر ایمان لے آئے۔ جب مجلس برخاست ہوئی تو ابوجہل اور اس کے چند ساتھیوں نے ان لوگوں کو راستہ میں جا لیا اور انہیں سخت ملامت کی کہ "بڑے نامراد ہو تم لوگ، تمہارے ہم مذہب لوگوں نے تم کو اس لیے بھیجا تھا کہ تم اس شخص کے حالات کی تحقیق کر کے آؤ اور انہیں ٹھیک ٹھیک خبر دو، مگر تم ابھی اس کے پاس بیٹھے ہی تھے کہ اپنا دین چھوڑ کر اس پر ایمان لے آئے۔ تم سے زیادہ احمق گروہ تو کبھی ہماری نظر سے نہیں گزرا"۔ اس پر انہوں نے جواب دیا

اور جب یہ ان کو سنایا جاتا ہے تو وہ کہتے ہیں کہ "ہم اس پر ایمان لائے، یہ واقعی حق ہے ہمارے رب کی طرف سے، ہم تو پہلے ہی سے مسلم ہیں[۵۶]"۔ یہ وہ لوگ ہیں جنہیں ان کا اجر

کہ "سلام ہے بھائیو تم کو، ہم تمہارے ساتھ جہالت بازی نہیں کر سکتے۔ ہمیں ہمارے طریقے پر چلنے دو اور تم اپنے طریقے پر چلتے رہو۔ ہم اپنے آپ کو جان بوجھ کر بھلائی سے محروم نہیں رکھ سکتے۔"

(سیرت ابن ہشام، ج ۲، ص ۳۲ - البدایہ والنہایہ، ج ۳، ص ۸۲)

۵۶ یعنی اس سے پہلے بھی ہم انبیا اور کتبِ آسمانی کے ماننے والے تھے، اس لیے اسلام کے سوا ہمارا کوئی اور دین نہ تھا۔ اور اب جو نبی اللہ تعالیٰ کی طرف سے کتاب لیکر آیا ہے اسے بھی ہم نے مان لیا ہے، لہٰذا درحقیقت ہمارے دین میں کوئی تبدیلی نہیں ہوئی ہے بلکہ جیسے ہم پہلے مسلمان تھے ویسے ہی اب بھی مسلمان ہیں۔

یہ قول اس بات کی صاف صراحت کر دیتا ہے کہ اسلام صرف اُس دین کا نام نہیں ہے جسے محمد صلی اللہ علیہ وسلم لیکر آئے ہیں اور "مسلم" کی اصطلاح محض حضور کے پیروؤں کے لیے مخصوص نہیں ہے، بلکہ ہمیشہ سے تمام انبیاء کا دین یہی اسلام تھا اور ہر زمانہ میں ان سب کے پیرو مسلمان ہی تھے۔ یہ مسلمان اگر کبھی کافر ہوئے تو صرف اس وقت جبکہ کسی بعد کے آنے والے نبی صادق کو ماننے سے انہوں نے انکار کیا۔ لیکن جو لوگ پہلے نبی کو مانتے تھے اور بعد کے آنے والے نبی پر بھی ایمان لے آتے اُن کے اسلام میں کوئی انقطاع واقع نہیں ہوا۔ وہ جیسے مسلمان پہلے تھے ویسے ہی بعد میں رہے۔

تعجب ہے کہ بعض بڑے بڑے اہلِ علم بھی اس حقیقت کے ادراک سے عاجز رہ گئے ہیں حتیٰ کہ اس صریح آیت کو دیکھ کر بھی ان کا اطمینان نہ ہوا۔ علامہ سیوطی نے ایک مفصل رسالہ اس موضوع پر لکھا کہ مسلم کی اصطلاح صرف امتِ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے مختص ہے۔ پھر جب یہ آیت سامنے آئی تو خود فرماتے ہیں کہ میرے ہاتھوں کے طوطے اُڑ گئے۔ لیکن کہتے ہیں کہ میں نے پھر خدا سے دعا کی کہ اس معاملہ میں مجھے شرح صدر عطا کرے۔ آخرکار اپنی رائے سے رجوع کرنے کے بجائے انہوں نے اس پر اصرار کیا اور اس آیت کی متعدد تاویلیں کر ڈالیں جو ایک سے ایک بڑھ کر بے وزن ہیں۔ مثلاً ان کی

ایک تاویل یہ ہے کہ انا کنا من قبلہ مسلمین کے معنی ہیں ہم قرآن کے آنے سے پہلے ہی مسلم بن جانے کا عزم رکھتے تھے کیونکہ ہمیں اپنی کتابوں سے اس کے آنے کی خبر مل چکی تھی اور ہمارا ارادہ یہ تھا کہ جب وہ آئیگا تو ہم اسلام قبول کریں گے۔ دوسری تاویل یہ ہے کہ اس فقرے میں مسلمین کے بعد لفظ بہ محذوف ہے، یعنی پہلے ہی سے ہم قرآن کو مانتے تھے کیونکہ اس کے آنے کی ہم توقع رکھتے تھے اور اس پر پیشگی ایمان لاتے ہوئے تھے، اس لیے توراۃ و انجیل کو ماننے کی بنا پر نہیں بلکہ قرآن کو اس کے نزول سے پہلے برحق مان لینے کی بنا پر ہم مسلم تھے۔ تیسری تاویل یہ ہے کہ تقدیر الٰہی میں ہمارے لیے پہلے ہی مقدر ہو چکا تھا کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور قرآن کی آمد پر ہم اسلام قبول کریں گے اس لیے درحقیقت ہم پہلے ہی سے مسلم تھے۔ ان تاویلوں میں سے کسی کو دیکھ کر بھی یہ محسوس نہیں ہوتا کہ اللہ کے عطا کردہ شرح صدر کا اس میں کوئی اثر موجود ہے۔

واقعہ یہ ہے کہ قرآن صرف اسی ایک مقام پر نہیں بلکہ بیسیوں مقامات پر اس اصولی حقیقت کو بیان کرتا ہے کہ اصل دین صرف "اسلام" (اللہ کی فرمانبرداری) ہے، اور خدا کی کائنات میں خدا کی مخلوق کے لیے اس کے سوا کوئی دوسرا دین ہو نہیں سکتا، اور آغاز آفرینش سے جو نبی بھی انسانوں کی ہدایت کے لیے آیا ہے وہ یہی دین لیکر آیا ہے، اور یہ کہ انبیاء علیہم السلام ہمیشہ خود مسلم رہے ہیں، اپنے پیرؤں کو انہوں نے مسلم ہی بن کر رہنے کی تاکید کی ہے، اور ان کے وہ سب متبعین جنہوں نے نبوت کے ذریعے سے آئے ہوئے فرمانِ خداوندی کے آگے سر تسلیم خم کیا، ہر زمانے میں مسلم ہی تھے۔ اس سلسلہ میں مثال کے طور پر صرف چند آیات ملاحظہ ہوں:

اِنَّ الدِّیْنَ عِنْدَ اللّٰہِ الْاِسْلَامُ (آل عمران۔ رکوع ۲)	درحقیقت اللہ کے نزدیک تو دین صرف اسلام ہے۔
وَمَنْ یَّبْتَغِ غَیْرَ الْاِسْلَامِ دِیْنًا فَلَنْ یُّقْبَلَ مِنْہُ (آل عمران۔ رکوع ۹)	اور جو کوئی اسلام کے سوا کوئی اور دین اختیار کرے وہ ہرگز قبول نہ کیا جائے گا۔

حضرت نوح علیہ السلام فرماتے ہیں:

إِنْ أَجْرِيَ إِلَّا عَلَى اللّٰهِ وَأُمِرْتُ أَنْ أَكُوْنَ مِنَ الْمُسْلِمِيْنَ۔ (یونس۔ رکوع ۸)

میرا اجر تو اللہ کے ذمہ ہے اور مجھے حکم دیا گیا ہے کہ میں مسلموں میں شامل ہو کر رہوں۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام اور ان کی اولاد کے متعلق ارشاد ہوتا ہے:

إِذْ قَالَ لَهُ رَبُّهُ أَسْلِمْ قَالَ أَسْلَمْتُ لِرَبِّ الْعٰلَمِيْنَ۔ وَوَصّٰى بِهٖ إِبْرٰهِيْمُ بَنِيْهِ وَيَعْقُوْبُ، يٰبَنِيَّ إِنَّ اللّٰهَ اصْطَفٰى لَكُمُ الدِّيْنَ فَلَا تَمُوْتُنَّ إِلَّا وَأَنْتُمْ مُسْلِمُوْنَ۔ أَمْ كُنْتُمْ شُهَدَاءَ إِذْ حَضَرَ يَعْقُوْبَ الْمَوْتُ، إِذْ قَالَ لِبَنِيْهِ مَا تَعْبُدُوْنَ مِنْ بَعْدِيْ، قَالُوْا نَعْبُدُ إِلٰهَكَ وَإِلٰهَ اٰبَائِكَ إِبْرٰهِيْمَ وَإِسْمٰعِيْلَ وَإِسْحٰقَ إِلٰهًا وَاحِدًا وَنَحْنُ لَهُ مُسْلِمُوْنَ۔ (البقرہ۔ رکوع ۱۶)

جبکہ اس کے رب نے اس سے کہا کہ مسلم (تابع فرمان) ہو جا، تو اس نے کہا میں مسلم ہو گیا رب العلمین کے لیے۔ اور اسی چیز کی وصیت کی ابراہیم نے اپنی اولاد کو اور یعقوب نے بھی، کہ اے میرے بچو، اللہ نے تمہارے لیے اس دین کو پسند کیا ہے لہٰذا تم کو موت نہ آئے مگر اس حال میں کہ تم مسلم ہو۔ کیا تم اس وقت موجود تھے جب یعقوبؑ کی وفات کا وقت آیا؟ جبکہ اس نے اپنی اولاد سے پوچھا کس کی بندگی کرو گے تم میرے بعد؟ انہوں نے جواب دیا ہم بندگی کریں گے آپ کے معبود اور آپ کے باپ دادا ابراہیم اور اسمٰعیل اور اسحٰق کے معبود کی، اس کو اکیلا معبود مان کر، اور ہم اسی کے مسلم ہیں۔

مَا كَانَ إِبْرٰهِيْمُ يَهُوْدِيًّا وَّلَا نَصْرَانِيًّا وَّلٰكِنْ كَانَ حَنِيْفًا مُّسْلِمًا (آل عمران رکوع ۷)

ابراہیم نہ یہودی تھا نہ نصرانی، بلکہ وہ یکسو مسلم تھا۔

حضرت ابراہیم و اسمٰعیل خود دعا مانگتے ہیں:

رَبَّنَا وَاجْعَلْنَا مُسْلِمَيْنِ لَكَ وَمِنْ ذُرِّيَّتِنَا أُمَّةً مُّسْلِمَةً لَّكَ (البقرہ رکوع ۱۵)

اے ہمارے رب، ہم کو اپنا مسلم بنا اور ہماری نسل سے ایک امت پیدا کر جو تیری مسلم ہو۔

حضرت لوطؑ کے قصے میں ارشاد ہوتا ہے:

فَمَا وَجَدْنَا فِيْهَا غَيْرَ بَيْتٍ مِّنَ

ہم نے قوم لوط کی بستی میں ایک گھر کے سوا مسلموں کا

الْمُسْلِمِيْنَ (الذاریات - رکوع ۲) — کوئی گھر نہ پایا۔

حضرت یوسفؑ بارگاہ رب العزت میں عرض کرتے ہیں:

تَوَفَّنِيْ مُسْلِمًا وَّ اَلْحِقْنِيْ بِالصّٰلِحِيْنَ — مجھ کو مسلم ہونے کی حالت میں موت دے اور
(یوسف - رکوع ۱۱) — صالحوں کے ساتھ ملا۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام اپنی قوم سے کہتے ہیں:

يٰقَوْمِ اِنْ كُنْتُمْ اٰمَنْتُمْ بِاللّٰهِ فَعَلَيْهِ — اے میری قوم کے لوگو، اگر تم اللہ پر ایمان لائے ہو
تَوَكَّلُوْا اِنْ كُنْتُمْ مُّسْلِمِيْنَ (یونس رکوع ۹) — تو اسی پہ بھروسہ کرو اگر تم مسلم ہو۔

بنی اسرائیل کا اصل مذہب یہودیت نہیں بلکہ اسلام تھا، اس بات کو دوست اور دشمن سب جانتے تھے۔ چنانچہ فرعون سمندر میں ڈوبتے وقت آخری کلمہ جو کہتا ہے وہ یہ ہے:

اٰمَنْتُ اَنَّهٗ لَآ اِلٰهَ اِلَّا الَّذِيْٓ اٰمَنَتْ — میں ایمان لایا اس بات پر کہ کوئی معبود اس کے
بِهٖ بَنُوْٓا اِسْرَآءِيْلَ وَاَنَا مِنَ الْمُسْلِمِيْنَ۔ — سوا نہیں ہے جس پہ بنی اسرائیل ایمان لائے ہیں
(یونس - رکوع ۹) — اور میں مسلموں میں سے ہوں۔

تمام انبیاء بنی اسرائیل کا دین بھی یہی اسلام تھا:

اِنَّآ اَنْزَلْنَا التَّوْرٰىةَ فِيْهَا هُدًى وَّ — ہم نے توراۃ نازل کی جس میں ہدایت اور روشنی
نُوْرٌ، يَحْكُمُ بِهَا النَّبِيُّوْنَ الَّذِيْنَ اَسْلَمُوْا — تھی، اسی کے مطابق وہ نبی جو مسلم تھے ان لوگوں
لِلَّذِيْنَ هَادُوْا۔ (المائدہ - رکوع ۷) — کے معاملات کے فیصلے کرتے تھے جو یہودی ہو گئے تھے

یہی حضرت سلیمان علیہ السلام کا دین تھا، چنانچہ ملکۂ سبا ان پر ایمان لاتے ہوئے کہتی ہے:

اَسْلَمْتُ مَعَ سُلَيْمٰنَ لِلّٰهِ رَبِّ — میں سلیمان کے ساتھ رب العالمین کی مسلم ہو
الْعٰلَمِيْنَ (النمل - رکوع ۳) — گئی۔

اور یہی حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور ان کے حواریوں کا دین تھا:

وَاِذْ اَوْحَيْتُ اِلَى الْحَوَارِيّٖنَ اَنْ — اور جبکہ میں نے حواریوں پہ وحی کی کہ ایمان لاؤ مجھ

دوبار دیا جائے گا اُس ثابت قدمی کے بدلے جو انہوں نے دکھائی۔ وہ بُرائی

اٰمِنُوْا بِیْ وَبِرَسُوْلِیْ قَالُوْٓا اٰمَنَّا وَاشْهَدْ بِاَنَّنَا مُسْلِمُوْنَ (المائدہ۔ رکوع ۱۵)

اور میرے رسول پر تو انہوں نے کہا ہم ایمان لاتے اور گواہ رہ کہ ہم مسلم ہیں۔

اس معاملہ میں اگر کوئی شک اس بنا پر کیا جاتے کہ عربی زبان کے الفاظ "اسلام" اور "مسلم" اِن مختلف ملکوں اور مختلف زبانوں میں کیسے مستعمل ہو سکتے تھے، تو ظاہر ہے کہ یہ محض ایک نادانی کی بات ہوگی۔ کیونکہ اصل اعتبار عربی کے اِن الفاظ کا نہیں بلکہ اُس معنی کا ہے جس کے لیے یہ الفاظ عربی میں مستعمل ہوتے ہیں۔ دراصل جو بات اِن آیات میں بتائی گئی ہے وہ یہ ہے کہ خدا کی طرف سے آیا ہوا حقیقی دین مسیحیت یا موسویت یا محمدیت نہیں ہے بلکہ انبیاء اور کتب آسمانی کے ذریعہ سے آتے ہوتے فرمانِ خداوندی کے آگے سرِ اطاعت جھکا دینا ہے، اور یہ رویہ جہاں جس بندۂ خدا نے بھی جس زمانے میں اختیار کیا ہے وہ ایک ہی عالمگیر ازلی و ابدی دینِ حق کا متبع ہے۔ اِس دین کو جن لوگوں نے ٹھیک ٹھیک شعور اور اخلاص کے ساتھ اختیار کیا ہے ان کے لیے موسیٰ کے بعد مسیح کو اور مسیح کے بعد محمد صلی اللہ علیہ وعلیہم اجمعین کو ماننا تبدیل مذہب نہیں بلکہ حقیقی دین کے اتباع کا فطری و منطقی تقاضا ہے۔ بخلاف اس کے جو لوگ انبیاء علیہم السلام کے گروہوں میں بے سوچے سمجھے گھس آتے یا پیدا ہو گئے، اور قومی و نسلی اور گروہی تعصبات نے جن کے لیے اصل مذہب کی حیثیت اختیار کرلی، وہ بس یہودی یا مسیحی بن کر رہ گئے اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے آنے پر ان کی جہالت کی قلعی کھل گئی۔ کیونکہ انہوں نے اللہ کے آخری نبی کا انکار کر کے نہ صرف یہ کہ آئندہ کے لیے مسلم رہنا قبول نہ کیا، بلکہ اپنی اس حرکت سے یہ ثابت کر دیا کہ حقیقت میں وہ پہلے بھی "مسلم" نہ تھے، محض ایک نبی یا بعض انبیاء کی شخصی گرویدگی میں مبتلا تھے، یا آباؤ اجداد کی اندھی تقلید کو دین بنائے بیٹھے تھے۔

۵۷ یعنی ایک اجر اس ایمان کا جو وہ پہلے سیدنا عیسیٰ علیہ السلام پر رکھتے تھے اور دوسرا اجر اس ایمان کا جو وہ اب نبی عربی محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر لاتے۔ یہی بات اس حدیث میں بیان کی گئی ہے جو بخاری و مسلم نے حضرت ابو موسیٰ اشعریؓ سے روایت کی ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ثلثۃ لھم اجران،

کو بھلائی سے دفع کرتے ہیں اور جو کچھ رزق ہم نے انہیں دیا ہے اس میں سے خرچ کرتے ہیں ۔ اور جب انہوں نے بیہودہ بات سُنی تو یہ کہکر اس سے کنارہ کش ہو گئے کہ "ہمارے اعمال ہمارے لیے اور تمہارے اعمال تمہارے لیے ، تم کو سلام ہے ، ہم جاہلوں کا سا طریقہ اختیار کرنا نہیں چاہتے " ۔ اے نبی ، تم جسے چاہو اس کو ہدایت نہیں دے سکتے ، مگر اللہ جسے چاہتا ہے ہدایت دیتا ہے اور وہ اُن لوگوں کو خوب جانتا ہے جو ہدایت قبول کرنے والے ہیں ۔

رجل من اھل الکتاب آمن بنبیہ و آمن بمحمد ۔۔۔۔ " تین شخص ہیں جن کو دوہرا اجر ملے گا ۔ ان میں سے ایک وہ ہے جو اہل کتاب میں سے تھا اور اپنے نبی پر ایمان رکھتا تھا ، پھر محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) پر ایمان لایا ۔"

۵۸ یعنی انہیں یہ دوہرا اجر اس بات کا ملیگا کہ وہ قومی و نسلی اور وطنی و گروہی تعصبات سے بچ کر اصل دینِ حق پر ثابت قدم رہے اور نئے نبی کی آمد پر جو سخت امتحان درپیش آیا اس میں انہوں نے ثابت کر دیا کہ دراصل وہ مسیح پرست نہیں بلکہ خدا پرست تھے ، اور شخصیتِ مسیح کے گرویدہ نہیں بلکہ "اسلام" کے متبع تھے اسی وجہ سے مسیح کے بعد جب دوسرا نبی وہی اسلام لیکر آیا جسے مسیح لائے تھے تو انہوں نے بے تکلف اس کی رہنمائی میں اسلام کا راستہ اختیار کر لیا اور اُن لوگوں کا راستہ چھوڑ دیا جو مسیحیت پر جمے رہ گئے ۔

۵۹ یعنی وہ بدی کا جواب بدی سے نہیں بلکہ نیکی سے دیتے ہیں ، جھوٹ کے مقابلے میں جھوٹ نہیں بلکہ صداقت لاتے ہیں ، ظلم کو ظلم سے نہیں بلکہ انصاف سے دفع کرتے ہیں ، شرارتوں کا سامنا شرارت سے نہیں بلکہ شرافت سے کرتے ہیں ۔

۶۰ یعنی وہ راہ حق میں مالی ایثار بھی کرتے ہیں ۔

۶۱ اشارہ ہے اس بیہودہ بات کی طرف جو ابو جہل اور اس کے ساتھیوں نے حبشی عیسائیوں کے اس وفد سے کی تھی ، جس کا ذکر اوپر حاشیہ ۵۵ میں گزر چکا ہے ۔

۶۲ سیاق کلام سے ظاہر ہے کہ حبشی عیسائیوں کے ایمان و اسلام کا ذکر کرنے کے بعد نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو مخاطب کر کے یہ فقرہ ارشاد فرمانے سے مقصود دراصل کفار مکہ کو شرم دلانا تھا ۔ کہنا یہ تھا کہ بدنصیبو ، ماتم کرو اپنی حالت پر کہ دوسرے کہاں کہاں سے آ کر اس نعمت سے مستفید ہو رہے ہیں اور تم اس چشمۂ فیض سے ، جو تمہارے اپنے گھر میں بہ رہا ہے ، محروم رہے جاتے ہو ۔ لیکن کہا گیا ہے اس انداز سے

وہ کہتے ہیں؟ "اگر ہم تمہارے ساتھ اس ہدایت کی پیروی اختیار کر لیں تو اپنی زمین سے اچک لیے جائیں"

کہ اے محمد صلی اللہ علیک وسلم، تم چاہتے ہو کہ میری قوم کے لوگ، میرے بھائی بند، میرے عزیز واقارب اس آبِ حیات سے بہرہ مند ہوں، لیکن تمہارے چاہنے سے کیا ہوتا ہے، ہدایت تو اللہ کے اختیار میں ہے، وہ اس نعمت سے انہی لوگوں کو فیض یاب کرتا ہے جن میں وہ قبولِ ہدایت کی آمادگی پاتا ہے، تمہارے رشتہ داروں میں اگر یہ جوہر موجود نہ ہو تو انہیں یہ فیض کیسے نصیب ہو سکتا ہے۔

صحیحین کی روایت ہے کہ یہ آیت نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے چچا ابو طالب کے معاملہ میں نازل ہوئی تھی۔ ان کا جب آخری وقت آیا تو حضورؐ نے اپنی حد تک انتہائی کوشش کی کہ وہ کلمۂ لا الٰہ الا اللہ پر ایمان لے آئیں تاکہ ان کا خاتمہ بالخیر ہو، مگر انہوں نے ملتِ عبدالمطلب پر ہی جان دینے کو ترجیح دی۔ اس پر اللہ تعالیٰ نے فرمایا انک لا تھدی من احببت۔ لیکن محدثین و مفسرین کا یہ طریقہ معلوم و معروف ہے کہ ایک آیت عہدِ نبوی کے جس معاملہ پر چسپاں ہوتی ہے اسے وہ آیت کی شانِ نزول کے طور پر بیان کرتے ہیں۔ اس لیے اس روایت اور اس مضمون کی اُن دوسری روایات سے جو ترمذی اور مسند احمد وغیرہ میں حضرات ابو ہریرہؓ، ابن عباسؓ، ابن عمرؓ وغیرہم سے مروی ہیں، لازماً یہی نتیجہ نہیں نکلتا کہ سورۂ قصص کی یہ آیت ابو طالب کی وفات کے وقت نازل ہوئی تھی۔ بلکہ ان سے صرف یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس آیت کے مضمون کی صداقت سب سے زیادہ اس موقع پر ظاہر ہوئی۔ اگرچہ حضورؐ کی دلی خواہش تو ہر بندۂ خدا کو راہِ راست پر لانے کی تھی، لیکن سب سے بڑھ کر اگر کسی شخص کا کفر پر خاتمہ ہوتا حضور کو شاق ہو سکتا تھا، اور ذاتی محبت و تعلق کی بنا پر سب سے زیادہ کسی شخص کی ہدایت کے آپ آرزو مند ہو سکتے تھے، تو وہ ابو طالب تھے لیکن جب ان کو ہدایت دینے پر بھی آپ قادر نہ ہوئے تو یہ بات بالکل ظاہر ہو گئی کہ کسی کو ہدایت بخشنا اور کسی کو اس سے محروم رکھنا نبی کے بس کی بات نہیں ہے۔ یہ معاملہ بالکل اللہ کے ہاتھ میں ہے، اور اللہ کے ہاں سے یہ دولت کسی رشتہ داری برادری کی بنا پر نہیں بلکہ آدمی کی قبولیت و استعداد اور مخلصانہ صداقت پسندی کی بنا پر عطا ہوتی ہے۔

۷۳ یہ وہ بات ہے جو کفارِ قریش اسلام قبول نہ کرنے کے لیے عذر کے طور پر پیش کرتے تھے اور اگر غور سے دیکھا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ ان کے کفر و انکار کا سب سے اہم بنیادی سبب یہی تھا۔

کیا یہ واقعہ نہیں ہے کہ ہم نے ایک پُرامن حرم کو ان کے لیے جائے قیام بنا دیا جس کی

اس بات کو ٹھیک ٹھیک سمجھنے کے لیے ہمیں دیکھنا ہوگا کہ تاریخی طور پر اُس زمانے میں قریش کی پوزیشن کیا تھی جس پر ضرب پڑنے کا انہیں اندیشہ تھا۔

قریش کو ابتداءً جس چیز نے عرب میں اہمیت دی وہ یہ تھی کہ ان کا حضرت اسماعیل علیہ السلام کی اولاد سے ہونا انسابِ عرب کی رُو سے بالکل ثابت تھا، اور اس بنا پر ان کا خاندان عربوں کی نگاہ میں پیرزادوں کا خاندان تھا۔ پھر جب قُصَیّ بن کلاب کے حسنِ تدبیر سے یہ لوگ کعبہ کے متولی ہوگئے اور مکّہ ان کا مسکن بن گیا تو ان کی اہمیت پہلے سے بہت زیادہ ہوگئی۔ اس لیے کہ اب وہ عرب کے سب سے بڑے تیرتھ کے مجاور تھے، تمام قبائلِ عرب میں ان کو مذہبی پیشوائی کا مقام حاصل تھا، اور حج کی وجہ سے عرب کا کوئی قبیلہ ایسا نہ تھا جو ان سے تعلقات نہ رکھتا ہو۔ اس مرکزی حیثیت سے فائدہ اٹھا کر قریش نے بتدریج تجارتی ترقی شروع کی اور خوش قسمتی سے روم و ایران کی سیاسی کشمکش نے ان کو بین الاقوامی تجارت میں ایک اہم مقام عطا کر دیا۔ اُس زمانہ میں روم و یونان اور مصر و شام کی جتنی تجارت بھی چین، ہندوستان، انڈونیشیا اور مشرقی افریقہ کے ساتھ تھی، اس کے سارے ناکے ایران نے روک دیے تھے۔ صرف ایک ہی راستہ اس تجارت کے لیے باقی رہ گیا تھا، اور وہ عرب کا راستہ تھا۔ اس صورتِ حال نے مکّہ کو بین الاقوامی تجارت کا ایک اہم مرکز بنا دیا۔ اُس وقت قریش ہی تھے جو مشرقی دنیا کے اموالِ تجارت لا کر مغربی دنیا کو، اور مغربی دنیا کے اموال لا کر مشرقی دنیا کو پہنچاتے تھے۔ لیکن عرب کی طوائف الملوکی کے ماحول میں یہ تجارتی نقل و حرکت اس کے بغیر نہ ہو سکتی تھی کہ تجارتی شاہراہیں جن قبائل کے علاقوں سے گزرتی تھیں ان کے ساتھ قریش کے گہرے تعلقات ہوں۔ سردارانِ قریش اس غرض کے لیے صرف اپنے مذہبی اثر پر اکتفا نہ کر سکتے تھے۔ اس کے لیے انہوں نے تمام قبائل کے ساتھ معاہدات کر رکھے تھے۔ تجارتی منافع میں سے بھی وہ ان کو حصہ دیتے تھے۔ شیوخِ قبائل اور با اثر سرداروں کو تحائف و ہدایا سے بھی خوش رکھتے تھے۔ اور سُودی کاروبار کا بھی ایک جال انہوں نے پھیلا رکھا تھا جس میں قریب قریب تمام ہمسایہ قبائل کے تجار اور سردار جکڑے ہوئے تھے۔

طرف ہر طرح کے ثمرات کھچے چلے آتے ہیں ہماری طرف سے رزق کے طور پر؟ مگر ان میں سے اکثر لوگ جانتے نہیں ہیں۔[۷۶]

ان حالات میں جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوتِ توحید اٹھی تو دینِ آبائی کے تعصب سے بھی بڑھکر جو چیز قریش کے لیے اُس کے خلاف وجہ اشتعال بنی وہ یہ تھی کہ اس دعوت کی بدولت انہیں اپنا مفاد خطرے میں نظر آرہا تھا۔ وہ سمجھتے تھے کہ معقول دلائل اور حجتوں سے شرک و بت پرستی غلط اور توحید صحیح بھی ہو تو اُس کو چھوڑنا اور اسے قبول کر لینا ہمارے لیے تباہ کن ہے۔ ایسا کرتے ہی تمام عرب ہمارے خلاف بھڑک اٹھے گا۔ ہمیں کعبہ کی تولیت سے بے دخل کر دیا جائیگا۔ بت پرست قبائل کے ساتھ ہمارے وہ تمام معاہدانہ تعلقات ختم ہو جائیں گے جن کی وجہ سے ہمارے تجارتی قافلے رات دن عرب کے مختلف حصوں سے گزرتے ہیں۔ اس طرح یہ دین ہمارا مذہبی رسوخ و اثر کا بھی خاتمہ کر دیگا اور ہماری معاشی خوشحالی کا بھی۔ بلکہ بعید نہیں کہ تمام قبائلِ عرب ہمیں سرے سے مکہ ہی چھوڑ دینے پر مجبور کر دیں۔

یہاں پہنچ کر دنیا پرستوں کی بے بصیرتی کا عجیب نقشہ انسان کے سامنے آتا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بار بار انہیں یقین دلاتے تھے کہ یہ کلمہ جو میں تمہارے سامنے پیش کر رہا ہوں اسے مان لو تو عرب و عجم تمہارے تابع ہو جائیں گے۔ مگر انہیں اس میں اپنی موت نظر آتی تھی۔ وہ سمجھتے تھے کہ جو دولت، اثر، رسوخ ہمیں آج حاصل ہے یہ بھی ختم ہو جائیگا۔ ان کو اندیشہ تھا کہ یہ کلمہ قبول کرتے ہی ہم اس سرزمین میں ایسے بے یار و مددگار ہو جائیں گے کہ چیل کوّے ہماری بوٹیاں نوچ کھائیں گے۔ ان کی کوتاہ نظری وہ وقت نہ دیکھ سکتی تھی جب چند ہی سال بعد تمام عرب محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے ماتحت ایک مرکزی سلطنت کا تابع فرمان ہونے والا تھا، پھر اسی نسل کی زندگی میں ایران، عراق، شام، مصر، سب ایک ایک کر کے اس سلطنت کے زیرِ نگیں ہو جانے والے تھے، اور اس قول پر ایک صدی گزرنے سے بھی پہلے قریش ہی کے خلفاء سندھ سے لیکر اسپین تک اور قفقاز سے لیکر یمن کے سواحل تک دنیا کے ایک بہت بڑے حصہ پر حکمرانی کرنے والے تھے۔

اور کتنی ہی ایسی بستیاں ہم تباہ کر چکے ہیں جن کے لوگ اپنی معیشت پر اترا گئے تھے۔ سو دیکھ لو، وہ ان کے مسکن پڑے ہوئے ہیں جن میں ان کے بعد کم ہی کوئی بسا ہے، آخرکار ہم ہی وارث ہو کر رہے۔[65]

[64] یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ان کے عذر کا پہلا جواب ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ یہ حرم جس کے امن وامان اور جس کی مرکزیت کی بدولت آج تم اس قابل ہوئے ہو کہ دنیا بھر کا مال تجارت اس وادیِ غیر ذی زرع میں کھچا چلا آ رہا ہے، کیا اس کو یہ امن اور یہ مرکزیت کا مقام تمہاری کسی تدبیر نے دیا ہے؟ ڈھائی ہزار برس پہلے چٹیل پہاڑوں کے درمیان اس بے آب و گیاہ وادی میں ایک اللہ کا بندہ اپنی بیوی اور ایک شیر خوار بچے کو لیکر آیا تھا۔ اس نے یہاں پتھر اور گارے کا ایک حجرہ تعمیر کر دیا اور پکار دیا کہ اللہ نے اسے حرم بنایا ہے، آؤ اس گھر کی طرف اور اس کا طواف کرو۔ اب یہ اللہ کی دی ہوئی برکت نہیں تو اور کیا ہے کہ ۲۵ صدیوں سے یہ جگہ عرب کا مرکز بنی ہوئی ہے، سخت بدامنی کے ماحول میں زمین کا صرف یہی گوشہ ایسا ہے جہاں امن میسر ہے، اس کو عرب کا بچہ بچہ احترام کی نگاہ سے دیکھتا ہے، اور ہر سال ہزارہا انسان اس کے طواف کے لیے چلے آتے ہیں۔ اسی نعمت کا ثمرہ تو ہے کہ تم عرب کے سردار بنے ہوئے ہو اور دنیا کی تجارت کا ایک بڑا حصہ تمہارے قبضے میں ہے۔ اب کیا تم یہ سمجھتے ہو کہ جس خدا نے یہ نعمت تمہیں بخشی ہے، اس سے منحرف اور باغی ہو کر تو تم پھلو پھولو گے مگر اس کے دین کی پیروی اختیار کرتے ہی برباد ہو جاؤ گے؟

[65] یہ ان کے عذر کا دوسرا جواب ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ جس مال و دولت اور خوشحالی پر تم اترائے ہوئے ہو، اور جس کے کھوئے جانے کے خطرے سے باطل پر جمنا اور حق سے منہ موڑنا چاہتے ہو، یہی چیز کبھی عاد اور ثمود اور سبا اور مدین اور قوم لوط کے لوگوں کو بھی حاصل تھی۔ پھر کیا یہ چیز ان کو تباہی سے بچا سکی؟ آخر معیارِ زندگی کی بلندی ہی تو ایک مقصود نہیں ہے کہ آدمی حق و باطل سے بے نیاز ہو کر بس اسی کے پیچھے پڑا رہے اور راہِ راست کو صرف اس لیے قبول کرنے سے انکار کر دے کہ ایسا کرنے سے یہ گوہرِ مقصود ہاتھ سے جانے کا خطرہ ہے۔ کیا تمہارے پاس

اور تیرا رب بستیوں کو ہلاک کرنے والا نہ تھا جب تک کہ ان کے مرکز میں ایک رسول نہ بھیج دیتا جو ان کو ہماری آیات سناتا۔ اور ہم بستیوں کو ہلاک کرنے والے نہ تھے جب تک کہ ان کے رہنے والے ظالم نہ ہو جاتے[۶۶]۔

تم لوگوں کو جو کچھ بھی دیا گیا ہے وہ محض دنیا کی زندگی کا سامان اور اس کی زینت ہے۔ اور جو کچھ اللہ کے پاس ہے وہ اس سے بہتر اور باقی تر ہے۔ کیا تم لوگ عقل سے کام نہیں لیتے؟ ع بھلا وہ شخص جس سے ہم نے اچھا وعدہ کیا ہو اور وہ اسے پانے والا ہو کبھی اس شخص کی طرح ہو سکتا ہے جسے ہم نے صرف حیاتِ دنیا کا سروسامان دے دیا ہو اور پھر وہ قیامت کے روز سزا کے لیے پیش کیا جانے والا ہو؟[۶۷]

اس کی کوئی ضمانت ہے کہ جن گمراہیوں اور بدکاریوں نے پچھلی خوشحال قوموں کو تباہ کیا انہی پر اصرار کر کے تم بچے رہ جاؤ گے اور ان کی طرح تمہاری شامت کبھی نہ آئے گی؟

۶۶۔ یہ ان کے عذر کا تیسرا جواب ہے۔ پہلے جو قومیں تباہ ہوئیں ان کے باشندے ظالم ہو چکے تھے، مگر خدا نے ان کو تباہ کرنے سے پہلے اپنے رسول بھیج کر انہیں متنبہ کیا، اور جب ان کی تنبیہ پر بھی وہ اپنی کج روی سے باز نہ آئیں تو انہیں ہلاک کر دیا۔ یہی معاملہ اب تمہیں درپیش ہے۔ تم بھی ظالم ہو چکے ہو، اور ایک رسول تمہیں بھی متنبہ کرنے کے لیے آ گیا ہے۔ اب تم کفر و انکار کی روش اختیار کر کے اپنے عیش اور اپنی خوشحالی کو بچاؤ گے نہیں بلکہ الٹا خطرے میں ڈالو گے۔ جس تباہی کا تمہیں اندیشہ ہے وہ ایمان لانے سے نہیں بلکہ انکار کرنے سے تم پر آئے گی۔

۶۷۔ یہ ان کے عذر کا چوتھا جواب ہے۔ اس جواب کو سمجھنے کے لیے پہلے دو باتیں اچھی طرح ذہن نشین ہو جانی چاہییں۔

اوّل یہ کہ دنیا کی موجودہ زندگی جس کی مقدار کسی کے لیے بھی چند سالوں سے زیادہ نہیں ہوتی، محض ایک سفر کا عارضی مرحلہ ہے۔ اصل زندگی جو ہمیشہ قائم رہنے والی ہے، آگے آنی ہے۔ موجودہ عارضی زندگی میں انسان خواہ کتنا ہی سروسامان جمع کر لے اور چند سال کیسے ہی عیش کے ساتھ بسر کر لے،

بہرحال اسے ختم ہونا ہے اور یہاں کا سب سروسامان آدمی کو یونہی چھوڑ کر اٹھ جانا ہے۔ اس مختصر سے عرصۂ حیات کا عیش اگر آدمی کو اس قیمت پر حاصل ہوتا ہو کہ آئندہ کی ابدی زندگی میں وہ دائمُ خستہ حال اور مبتلائے مصیبت رہے، تو کوئی صاحبِ عقل آدمی یہ خسارے کا سودا نہیں کر سکتا۔ اس کے مقابلہ میں ایک عقلمند آدمی اس کو ترجیح دیگا کہ یہاں چند سال مصیبتیں بھگت لے، مگر یہاں وہ بھلائیاں کما کرلے جائے جو بعد کی دائمی زندگی میں اس کے لیے ہمیشگی کے عیش کی موجب بنیں۔

دوسری بات یہ ہے کہ اللہ کا دین انسان سے یہ مطالبہ نہیں کرتا کہ وہ اس دنیا کی متاعِ حیات سے استفادہ نہ کرے اور اس کی زینت کو خواہ مخواہ لات ہی مار دے۔ اس کا مطالبہ صرف یہ ہے کہ وہ دنیا پر آخرت کو ترجیح دے، کیونکہ دنیا فانی ہے اور آخرت باقی، اور دنیا کا عیش کم تر ہے اور آخرت کا عیش بہتر۔ اس لیے دنیا کی وہ متاع اور زینت تو آدمی کو ضرور حاصل کرنی چاہیے جو آخرت کی باقی رہنے والی زندگی میں اسے سرخرو کرے، یا کم از کم یہ کہ اسے وہاں کے ابدی خسارے میں مبتلا نہ کرے۔ لیکن جہاں معاملہ مقابلے کا آپڑے، یعنی دنیا کی کامیابی اور آخرت کی کامیابی ایک دوسرے کی ضد ہو جائیں، وہاں دینِ حق کا مطالبہ انسان سے یہ ہے، اور یہی عقلِ سلیم کا مطالبہ بھی ہے کہ آدمی دنیا کو آخرت پر قربان کر دے اور اس دنیا کی عارضی متاع و زینت کی خاطر وہ راہ ہرگز اختیار نہ کرے جس سے ہمیشہ کے لیے اس کی عاقبت خراب ہوتی ہو۔

ان دو باتوں کو نگاہ میں رکھ کر دیکھیے کہ اللہ تعالیٰ اوپر کے فقروں میں کفارِ مکہ سے کیا فرماتا ہے۔ وہ یہ نہیں فرماتا کہ تم اپنی تجارت لپیٹ دو، اپنے کاروبار ختم کر دو، اور ہمارے پیغمبر کو مان کر فقیر ہو جاؤ۔ بلکہ وہ یہ فرماتا ہے کہ یہ دنیا کی دولت جس پر تم ریجھے ہوئے ہو، بہت تھوڑی دولت ہے اور بہت تھوڑے دنوں کے لیے تم اس کا فائدہ اس حیاتِ دنیا میں اٹھا سکتے ہو۔ اس کے برعکس اللہ کے ہاں جو کچھ ہے وہ اس کی بہ نسبت کم و کیف (QUALITY اور QUANTITY) میں بھی بہتر ہے اور ہمیشہ باقی رہنے والا بھی ہے۔ اس لیے تم سخت حماقت کرو گے اگر اس عارضی زندگی کی محدود نعمتوں سے متمتع ہونے کی خاطر وہ روش اختیار کرو جس کا نتیجہ آخرت کے دائمی خسارے کی شکل میں

اور[۶۸] بھول نہ جائیں یہ لوگ، اس دن کو جبکہ وہ ان کو پکاریگا اور پوچھے گا "کہاں ہیں میرے وہ شریک جن کا تم گمان رکھتے تھے؟" یہ قول جن پر چسپاں ہو گا[۶۹] وہ کہیں گے "اے ہمارے رب، بے شک یہی لوگ ہیں جن کو ہم نے گمراہ کیا تھا۔ انہیں ہم نے اسی طرح گمراہ کیا جیسے ہم خود گمراہ ہوئے۔ ہم آپ کے سامنے برأت کا اظہار کرتے ہیں[۷۰] یہ ہماری تو

تمہیں بھگتنا پڑے۔ تم خود مقابلہ کر کے دیکھ لو کہ کامیاب آیا وہ شخص ہے جو محنت و جانفشانی کے ساتھ اپنے رب کی خدمت بجا لاتے اور پھر ہمیشہ کے لیئے اس کے انعام سے سرفراز ہو، یا وہ شخص جو گرفتار ہو کر مجرم کی حیثیت سے خدا کی عدالت میں پیش کیا جانے والا ہو اور گرفتاری سے پہلے محض چند روز حرام کی دولت سے مزے لوٹ لینے کا اس کو موقع مل جائے؟

۶۸؎ یہ تقریر بھی اسی پچھلے جواب کے سلسلہ میں ہے، اور اس کا تعلق اوپر کی آیت کے آخری فقرے سے ہے۔ اس میں یہ بتایا جا رہا ہے کہ محض اپنے دنیوی مفاد کی خاطر شرک و بت پرستی اور انکارِ نبوت کی جس گمراہی پر یہ لوگ اصرار کر رہے ہیں، آخرت کی ابدی زندگی میں اس کا کیسا بُرا نتیجہ انہیں دیکھنا پڑیگا۔ اس سے یہ احساس دلانا مقصود ہے کہ فرض کرو دنیا میں تم پر کوئی آفت نہ بھی آئے اور یہاں کی مختصر سی زندگی میں تم حیاتِ دنیا کی متاع و زینت سے خوب بہرہ اندوز بھی ہو لو تب بھی اگر آخرت میں اس کا انجام یہی کچھ ہونا ہے تو خود سوچ لو کہ یہ نفع کا سودا ہے جو تم کر رہے ہو، یا سراسر خسارے کا؟

۶۹؎ اس سے مراد وہ شیاطین جن و انس ہیں جن کو دنیا میں خدا کا شریک بنایا گیا تھا، جن کی بات کے مقابلے میں خدا اور اس کے رسولوں کی بات کو رد کیا گیا تھا، اور جن کے اعتماد پر صراطِ مستقیم کو چھوڑ کر زندگی کے غلط راستے اختیار کیے گئے تھے۔ ایسے لوگوں کو خواہ کسی نے الٰہ اور رب کہا ہو یا نہ کہا ہو، بہر حال جب ان کی اطاعت و پیروی اس طرح کی گئی جیسی خدا کی ہونی چاہیے تو لازماً انہیں خدائی میں شریک کیا گیا۔

۷۰؎ یعنی ہم نے زبردستی ان کو گمراہ نہیں کیا تھا، ہم نے نہ ان سے بینائی اور سماعت سلب کی تھی نہ ان سے سوچنے سمجھنے کی صلاحیتیں چھین لی تھیں، اور نہ ایسی ہی کوئی صورت پیش آئی تھی کہ یہ تو

بندگی نہیں کرتے تھے[۷۱]" پھر اِن سے کہا جائیگا کہ پکارو اب اپنے ٹھیرائے ہوئے شریکوں کو[۷۲]۔ یہ انہیں پکاریں گے مگر وہ اِن کو کوئی جواب نہ دیں گے۔ اور یہ لوگ عذاب دیکھ لیں گے۔ کاش یہ ہدایت اختیار کرنے والے ہوتے۔

اور (فراموش نہ کریں یہ لوگ) وہ دن جبکہ وہ اِن کو پکاریگا اور پوچھے گا کہ "جو رسول بھیجے گئے تھے انہیں تم نے کیا جواب دیا تھا؟" اُس وقت کوئی جواب اِن کو نہ سوجھے گا اور نہ یہ آپس میں ایک دوسرے سے پوچھ ہی سکیں گے۔ البتہ جس نے آج توبہ کر لی اور ایمان لے آیا اور نیک عمل کیے وہی یہ توقع کر سکتا ہے کہ وہاں فلاح پانے والوں میں سے ہوگا۔

تیرا رب پیدا کرتا ہے جو کچھ چاہتا ہے اور (وہ خود ہی اپنے کام کے لیے جسے چاہتا ہے) منتخب کر لیتا ہے، یہ انتخاب اِن لوگوں کے کرنے کا کام نہیں ہے[۷۳]۔ اللہ پاک

راہِ راست کی طرف جانا چاہتے ہوں مگر ہم ان کا ہاتھ پکڑ کر جبراً انہیں غلط راستے پر کھینچ لے گئے ہوں۔ بلکہ جس طرح ہم خود اپنی مرضی سے گمراہ ہوئے تھے اسی طرح ان کے سامنے بھی ہم نے گمراہی پیش کی اور انہوں نے اپنی مرضی سے اس کو قبول کیا۔ لہٰذا ہم ان کی ذمہ داری قبول نہیں کرتے۔ ہم اپنے فعل کے ذمہ دار ہیں اور یہ اپنے فعل کے ذمہ دار۔

یہاں یہ لطیف نکتہ قابلِ توجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ سوال تو کریگا شریک ٹھیرانے والوں سے۔ مگر قبل اس کے کہ وہ کچھ بولیں، جواب دینے لگیں گے وہ جن کو شریک ٹھیرایا گیا تھا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ جب عام مشرکین سے یہ سوال کیا جائے گا تو ان کے لیڈر اور پیشوا محسوس کرینگے کہ اب آگئی ہماری شامت۔ یہ ہمارے سابق پیرو ضرور کہیں گے کہ یہ لوگ ہماری گمراہی کے اصل ذمہ دار ہیں۔ اس لیے پیرووں کے بولنے سے پہلے وہ خود سبقت کرکے اپنی صفائی پیش کرنی شروع کر دیں گے۔

۷۱ یعنی یہ ہمارے نہیں بلکہ اپنے ہی نفس کے بندے بنے ہوئے تھے۔

۷۲ یعنی انہیں مدد کے لیے پکارو۔ دنیا میں تو تم نے ان پر بھروسا کرکے ہماری بات رد کی تھی۔ اب یہاں ان سے کہو کہ آئیں اور تمہاری مدد کریں اور تمہیں عذاب سے بچائیں۔

ہے اور بہت بالاتر ہے اُس شرک سے جو یہ لوگ کرتے ہیں۔ تیرا رب جانتا ہے جو کچھ یہ دلوں میں چھپائے ہوئے ہیں اور جو کچھ یہ ظاہر کرتے ہیں[۹۴]۔ وہی ایک اللہ ہے جس کے

۹۳؎ یہ ارشاد دراصل شرک کی تردید میں ہے۔ مشرکین نے اللہ تعالیٰ کی مخلوقات میں سے جو بے شمار معبود اپنے لیے بنا لیے ہیں اور ان کو اپنی طرف سے جو اوصاف، مراتب اور مناصب سونپ رکھے ہیں، اس پر اعتراض کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ اپنے پیدا کیے ہوئے انسانوں، فرشتوں، جنوں اور دوسرے بندوں میں سے ہم خود جس کو جیسے چاہتے ہیں اوصاف، صلاحیتیں اور طاقتیں بخشتے ہیں اور جو کام جس سے لینا چاہتے ہیں، لیتے ہیں۔ یہ اختیارات آخر ان مشرکین کو کیسے اور کہاں سے مل گئے کہ میرے بندوں میں سے جس کو چاہیں مشکل کشا، جسے چاہیں گنج بخش اور جسے چاہیں فریاد رس قرار دے لیں؟ جسے چاہیں بارش برسانے کا، جسے چاہیں روزگار یا اولاد بخشنے والا، جسے چاہیں بیماری و صحت کا مالک بنا دیں؟ جسے چاہیں میری خدائی کے کسی حصّے کا فرمانروا ٹھیرا لیں؟ اور میرے اختیارات میں سے جو کچھ جس کو چاہیں سونپ دیں؟ کوئی فرشتہ ہو یا جن یا نبی یا ولی، بہرحال جو بھی ہے ہمارا پیدا کیا ہوا ہے۔ جو کمالات بھی کسی کو ملے ہیں ہماری عطا و بخشش سے ملے ہیں۔ اور جو خدمت بھی ہم نے جس سے لینی چاہی ہے لی ہے۔ اس برگزیدگی کے یہ معنی آخر کیسے ہو گئے کہ یہ بندے بندگی کے مقام سے اٹھا کر خدائی کے مرتبے پر پہنچا دیے جائیں اور خدا کو چھوڑ کر ان کے آگے سرِ نیاز جھکا دیا جائے۔ ان کو مدد کے لیے پکارا جانے لگے، ان سے حاجتیں طلب کی جانے لگیں، انہیں قسمتوں کا بنانے اور بگاڑنے والا سمجھ لیا جائے، اور انہیں خدائی صفات و اختیارات کا حامل قرار دے دیا جائے؟

۹۴؎ اس سلسلۂ کلام میں یہ بات جس مقصد کے لیے ارشاد فرمائی گئی ہے وہ یہ ہے کہ ایک شخص یا گروہ دنیا میں لوگوں کے سامنے یہ دعویٰ کر سکتا ہے کہ جس گمراہی کو اس نے اختیار کیا ہے اس کی صحت پر وہ بڑے معقول وجوہ سے مطمئن ہے، اور اس کے خلاف جو دلائل دیے گئے ہیں ان سے فی الحقیقت اس کا اطمینان نہیں ہوا ہے، اور اس گمراہی کو اس نے کسی بُرے جذبے سے نہیں بلکہ خالص نیک نیتی کے ساتھ اختیار کیا ہے، اور اس کے سامنے کبھی کوئی ایسی چیز نہیں آئی ہے جس سے اس کی

سوا کوئی عبادت کا مستحق نہیں، اسی کے لیے حمد ہے دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی، فرمانروائی اسی کی ہے اور اسی کی طرف تم سب پلٹائے جانے والے ہو۔ اے نبی، ان سے کہو کبھی تم لوگوں نے غور کیا کہ اگر اللہ قیامت تک تم پر ہمیشہ کے لیے رات طاری کر دے تو اللہ کے سوا وہ کونسا معبود ہے جو تمہیں روشنی لا دے؟ کیا تم سنتے نہیں ہو؟ ان سے پوچھو، کبھی تم نے سوچا کہ اگر اللہ قیامت تک تم پر ہمیشہ کے لیے دن طاری کر دے تو اللہ کے سوا وہ کونسا معبود ہے جو تمہیں رات لا دے تاکہ تم اس میں سکون حاصل کر سکو؟ کیا تم کو سوجھتا نہیں؟ یہ اسی کی رحمت ہے کہ اس نے تمہارے لیے رات اور دن بنائے تاکہ تم (رات میں) سکون حاصل کرو اور (دن کو) اپنے رب کا فضل تلاش کرو، شاید کہ تم شکر گزار بنو۔

(یاد رکھیں یہ لوگ) وہ دن جبکہ وہ انہیں پکاریگا پھر پوچھے گا کہاں ہیں میرے وہ شریک جن کا تم گمان رکھتے تھے؟ اور ہم ہر امت میں سے ایک گواہ نکال لائینگے پھر کہینگے کہ "لاؤ اب اپنی دلیل"۔ اس وقت انہیں معلوم ہو جائیگا کہ حق اللہ کی طرف ہے، اور گم ہو جائیں گے ان کے وہ سارے جھوٹ جو انہوں نے گھڑ رکھے تھے ع ع

غلطی اس پر واضح ہو۔ لیکن اللہ تعالیٰ کے سامنے اس کی یہ بات نہیں چل سکتی۔ وہ صرف ظاہر ہی کو نہیں دیکھتا۔ اس کے سامنے تو آدمی کے دل و دماغ کا ایک ایک گوشہ کھلا ہوا ہے۔ وہ اس کے علم اور احساسات اور جذبات اور خواہشات اور نیت اور ضمیر، ہر چیز کو براہِ راست جانتا ہے۔ اس کو معلوم ہے کہ کس شخص کو کس وقت کن ذرائع سے تنبیہ ہوئی، کن کن راستوں سے حق پہنچا، کس کس طریقے سے باطل کا باطل ہونا اس پر کھلا، اور پھر وہ اصل محرکات کیا تھے جن کی بنا پر اس نے اپنی گمراہی کو ترجیح دی اور حق سے منہ موڑا۔

۵؎ یعنی وہ نبی جس نے اس امت کو خبردار کیا تھا، یا انبیاء کے پیروؤں میں سے کوئی ایسا ہدایت یافتہ انسان جس نے اس امت میں تبلیغ حق کا فریضہ انجام دیا تھا، یا کوئی ایسا ذریعہ جس سے اس امت تک پیغامِ حق پہنچ چکا تھا۔

۶؎ یعنی اپنی صفائی میں کوئی ایسی حجت پیش کرو جس کی بنا پر تمہیں معاف کیا جا سکے۔ یا تو یہ ثابت کرو کہ تم جس شرک جس انکارِ آخرت اور جس انکارِ نبوت پر قائم تھے وہ برحق تھا اور تم نے معقول وجوہ کی بنا پر یہ مسلک اختیار کیا تھا۔ یا یہ نہیں تو پھر کم از کم یہی ثابت کرو کہ خدا کی طرف سے تم کو اس غلطی پر متنبہ کرنے اور ٹھیک بات تم تک پہنچانے کا کوئی انتظام نہیں کیا گیا تھا۔

ارض القرآن کی رُودادِ سفر

(از محمد عاصم صاحب (رفیق سفر)

۱۹۵۶ء میں مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی نے پہلی مرتبہ عرب ممالک کا سفر کیا اور حج و زیارت سے مشرف ہوئے۔ حج و زیارت کے علاوہ مولانا کا ارادہ تھا کہ مکہ معظمہ اور مدینہ منورہ کے تمام آثار کو بھی دیکھا جاتے، لیکن ایک تو گرمی کا سخت موسم، دوسرے وقت کی کمی اور تیسرے مولانا کی صحت کی خرابی۔ اس لیے مولانا کی یہ دلی خواہش پوری نہ ہوسکی۔ یوں بھی حج کی مصروفیات اور حجاج کی گہما گہمی میں اس قسم کی کسی خواہش کا پورا ہونا کوئی آسان بات نہیں ہوتا۔ جب انسان پہلی مرتبہ حج کے لیے جاتا ہے تو اسے پوری کوشش کے باوجود یہ سجھائی ہی نہیں دیتا کہ حج کی ضروری مصروفیات سے وقت نکال کر اپنے کسی علمی قسم کے پروگرام کیونکر شروع کرے اور کیونکر اسے پایۂ تکمیل تک پہنچائے۔ بہت سی چیزوں کی خواہش اپنے دل میں لے کر وہ سرزمین حجاز میں قدم رکھتا ہے، اور وہاں پہنچ کر ان کے لیے کوشش بھی کرتا ہے، لیکن جب وہاں سے پلٹتا ہے تو اس کے دل میں یہ احساس برابر چٹکیاں لیتا رہتا ہے کہ وہ اپنی مرضی اور خواہش کے مطابق اپنے کسی پروگرام کو پایۂ تکمیل تک نہیں پہنچا سکا۔ کچھ اسی قسم کی کیفیت سفر حج کے بعد مولانا پر بھی طاری ہوئی۔ مکہ معظمہ اور مدینہ منورہ کے قیام کے دوران وہ وہاں کے تاریخی آثار دیکھنے کے لیے نکلتے بھی رہے لیکن اتنا وقت اور سکون ان کے پاس کہاں کہ وہ ان آثار کا تفصیلی مطالعہ کر سکیں۔ چنانچہ سفر سے واپسی ہی پر مولانا نے یہ طے کیا کہ آئندہ کبھی سردی کے موسم میں عمرہ بھی کیا جائے اور سرزمین عرب کے تمام تاریخی آثار و مقامات کا بھی تفصیل سے مطالعہ کیا جائے۔ حقیقت یہ ہے کہ حج اور عمرے کے الگ الگ فائدے

ہیں۔ حج تو فرض ہی ہے اس لیے اس میں جو فائدے ہیں وہ عمرہ سے حاصل نہیں ہو سکتے، لیکن عمرہ کو ایک نفلی عبادت قرار دے کر اللہ تعالیٰ نے اس میں جو فائدے رکھے ہیں، وہ بھی ایسے ہیں کہ ایام حج میں حج کے ساتھ محض ضمنی طور پر انہیں حاصل نہیں کیا جا سکتا۔

لیکن صحت کی مسلسل خرابی اور مشاغل کی زیادتی نے مولانا کو تین سال تک اتنی مہلت نہ دی کہ وہ اپنی مندرجہ بالا خواہش پوری کرنے کے لیے عرب ممالک کا سفر کر سکیں۔ ملک میں مارشل لا نافذ ہو جانے کے بعد مولانا کو اپنے مسلسل کاموں سے جو یک گونہ رخصت ملی، تو ان کے ذہن نے بھی قدرے راحت محسوس کی اور اپنے علمی پروگراموں کو پایہ تکمیل تک پہنچانے کی فکر ان کے دماغ پر مسلط رہنے لگی۔ گزشتہ چند ماہ کے علاج سے صحت کے بارے میں بھی مولانا کو اتنا اطمینان ہو گیا تھا کہ وہ سفر کی صعوبتوں کو بہر حال جھیل سکیں گے

اب مولانا نے اپنے ذہن میں سرزمین عرب کے سفر کا وسیع نقشہ بنایا اور طے کیا کہ نہ صرف حجاز کی زیارت کی جائے، بلکہ نجد، حجاز، شرق اردن، فلسطین، شام اور مصر کے بھی ان تمام آثار و تاریخی مقامات کو دیکھا جائے جن کا ذکر قرآن مجید اور سیرت پاک کی کتابوں میں آیا ہے۔ عراق میں بھی اگرچہ قرآن، سیرت اور اسلامی تاریخ سے متعلق آثار کی کمی نہیں، لیکن موجودہ حالات میں ایک پاکستانی --- اور وہ بھی مولانا مودودی --- کے لیے عراق کا سفر کرنا کسی طرح ممکن نہیں۔ مولانا کے بقول جسے گولی کھانی ہو، وہ اس زمانے میں ادھر کا رخ کرے اور اگر گولی کھانی ہی ٹھہری تو اس کے لیے عراق جانا ہی کونسا ضروری ہے؟

گزشتہ سال کے وسط میں مولانا نے سعودی عرب، اردن اور متحدہ عرب جمہوریہ کے سفراء مقیم کراچی کو اپنے اس ارادے سے مطلع کیا اور ان سے یہ خواہش کی کہ وہ اپنی اپنی حکومتوں کو خطوط لکھ کر معلوم کریں کہ وہ اس قسم کے علمی سفر کے سلسلے میں انہیں کہاں تک سہولتیں بہم پہنچا سکتی ہیں، کیونکہ ان ملکوں میں مطلوبہ تاریخی آثار کو دیکھنا اس وقت تک

ممکن نہیں جب تک ان کی حکومتوں کا تعاون یا کم از کم ان کی طرف سے ہر جگہ جانے کی اجازت حاصل نہ ہو۔ پھر موجودہ سیاسی حالات میں بھی یہی مناسب تھا کہ سفر سے پہلے متعلقہ ممالک کی حکومتوں سے پوچھ لیا جائے۔

سعودی سفیر استاذ محمد الحمد الشبیلی نے تو نہ صرف ویزا دینے کا وعدہ کیا بلکہ یقین دلایا کہ سعودی حکومت مولانا کو اپنے ملک میں داخل ہونے کے بعد سفر کے سلسلے میں ہر طرح کی سہولت بہم پہنچائے گی۔ کچھ اسی قسم کا جواب اردن کے قونصل استاذ ہاشم اتیل نے بھی دیا، لیکن جمہوریہ عربیہ کی طرف سے کوئی جواب کراچی چھوڑنے تک وصول نہ ہوا۔ تاہم مولانا نے اس خیال سے سفر کی تیاری جاری رکھی کہ اگر مصر و شام جانا نہ بھی ہوا تو فی الحال سعودی عرب اور اردن (مع فلسطین) ہی پر اکتفا کریں گے۔

اس کے بعد سوال ایکسچینج کا تھا کہ معلوم نہیں موجودہ حالات میں ہماری اپنی حکومت اتنا ایکسچینج دیتی بھی ہے کہ نہیں، جس سے یہ سفر کیا جا سکے۔ سٹیٹ بنک کو پانچ ہزار روپے ایکسچینج کے لیے درخواست دی گئی۔ لیکن اس نے صرف سوا تین ہزار کا ایکسچینج (۲۵۰ پونڈ) دینے کا وعدہ کیا۔ اگرچہ یہ رقم مولانا کے پیش نظر سفر کے لیے بالکل ناکافی تھی، لیکن مولانا نے خدا کے بھروسے پر اس کو قبول کر کے سفر کا عزم کر لیا۔

مولانا نے اپنی رفاقت کے لیے دو آدمیوں کو اپنے ساتھ لے جانے کا بھی فیصلہ کیا۔ ایک کراچی کے چودھری غلام محمد صاحب اور دوسرے مجھے۔ سفر کی نوعیت بھی کچھ اس طرح کی تھی کہ اس میں کم از کم تین آدمیوں کا ہونا ضروری تھا۔

چودھری غلام محمد صاحب تو کویت میں اپنے متعلق جاننے والوں کے اصرار اور دعوت پر ۱۰/ اکتوبر ہی کو کراچی سے کویت روانہ ہو گئے، اور یہ طے پایا کہ جب ہم (مولانا اور میں) اپنے پروگرام کے مطابق ظہران (سعودی عرب) پہنچیں گے تو وہ کویت سے ہمیں وہیں آ ملیں گے۔

لاہور سے روانگی: ہم (مولانا اور میں) نے لاہور ہی میں ہیضے اور چیچک کے ٹیکے لگوائے،

کیونکہ سعودی عرب، اردن اور جمہوریہ عربیہ کا ویزا حاصل کرنے سے پہلے ان کا لگوانا ضروری تھا۔ پھر ۲۲؍اکتوبر کو ہم بذریعہ خیبر میل لاہور سے روانہ ہو کر ۲۳؍ کی صبح کراچی پہنچ گئے۔ مولانا کے اس سفر کی اطلاع ایک دن پہلے تسنیم میں آ چکی تھی، اس لیے احباب و رفقاء تقریباً ہر اسٹیشن پر آکر مولانا سے ملاقات کرتے رہے۔ یہ سلسلہ رات کے ساڑھے گیارہ بجے یعنی روہڑی سٹیشن تک جاری رہا۔ اس کے بعد رات زیادہ ہو گئی تھی اور مولانا کے سونے کا وقت تھا۔ اس لیے حیدر آباد یا اگلے کسی سٹیشن پر کوئی صاحب ملاقات کے لیے نہیں آتے۔ لوگوں نے عقلمندی کی، ورنہ مولانا کو نیند ہی کی حالت میں بیدار ہونا پڑتا۔

کراچی کا قیام

ہمارا خیال کراچی میں زیادہ دن ٹھہرنے کا نہیں تھا۔ کراچی سے ہر ہفتہ ایک بحری جہاز بصرہ جاتا ہے۔ ۲۷؍اکتوبر کو ایک جہاز کے جانے کی تاریخ تھی۔ ہمارا پروگرام اسی سے روانہ ہونے کا تھا۔ خیال تھا کہ تین چار دنوں میں ویزا، ایکسچینج اور ٹکٹ کے تمام مراحل طے ہو جائیں گے اور ہم ۲۷ کو بآسانی روانہ ہو سکیں گے مگر بعض اوقات معمولی سی بات پر کوئی ایسا اڑنگا لگ جاتا ہے کہ آدمی کا سارا پروگرام دھرے کا دھرا رہ جاتا ہے۔

ویزوں کے حصول میں ہمیں کوئی خاص دقت پیش نہیں آئی۔ سعودی عرب کے سفیر استاذ محمد الحمد الشبیلی نے نہ صرف یہ کہ ویزا دیا بلکہ ایک روز انہوں نے ہماری شاندار دعوت بھی کی، ہمارے سفر کے متعلق اپنی حکومت اور ریاض کے بعض علماء کو بذریعہ تار اطلاع دی اور تین خط دستی ہمارے حوالے کیے، ایک ہر اس سعودی آفیسر کے نام جو سرحد پر کسی دوسری جگہ متعین ہو تاکہ سفر کے سلسلے میں وہ ہماری ہر ممکن مدد کرے، دوسرا ریاض کے شیخ عبداللطیف بن ابراہیم (دینی معاہد کے نگران اور مفتی اکبر شیخ محمد ابراہیم کے چھوٹے بھائی) کے نام اور تیسرا ریاض ہی کے شیخ عبدالعزیز بن باز کے نام۔

اردن کے قونصل استاذ ہاشم التل نے بھی نہ صرف ویزا دیا بلکہ انہوں نے مولانا سے خصوصی ملاقات کی خواہش ظاہر کی۔ ایک روز مولانا ان کے ہاں گئے، تو انہوں نے بتایا کہ میں

آج ہی ایک کام کے سلسلے میں دو ہفتہ کے لیے اپنے ملک جا رہا ہوں، وہاں تمام متعلقہ افسران کو میں آپ کی آمد کی اطلاع دے دوں گا تاکہ اردن میں داخل ہونے کے بعد آپ کو سفر کے سلسلے میں ہر طرح کی آسانیاں بہم پہنچائی جا سکیں۔ انہوں نے بھی ایک خط سرحد پر کسٹم والوں کے نام دستی طور پر ہمارے حوالے کیا۔

جمہوریہ عربیہ کے سفیر استاذ طہٰ فتح الدین سے بھی بآسانی ویزا مل گیا۔ مصر کے سفر کے سلسلے میں یوں تو ہمیں کسی پریشانی کا اندیشہ نہ تھا، صرف یہ خیال تھا کہ ہم مصر کا سفر صرف جبل طور (سینا) کے لیے اختیار کر رہے ہیں اور سینا ان دنوں فوجی علاقہ ہے جہاں کوئی مصری بھی حکومت کی خصوصی اجازت کے بغیر داخل نہیں ہو سکتا، اس لیے ایسا نہ ہو کہ ہم وقت اور پیسہ خرچ کر کے مصر پہنچیں اور وہاں ہمیں یکایک یہ معلوم ہو کہ سینا میں داخلے کی اجازت نہیں مل سکتی۔ تاہم ہم نے جمہوریہ عربیہ کے سفیر سے گفتگو کی ضرورت نہیں سمجھی اور یہ طے کیا کہ سینا کی اجازت کے سلسلے میں جمہوریہ عربیہ کے سفیر متعینہ سعودی عرب سے گفتگو کی جائے گی۔

ویزا کے حصول کے بعد سٹیٹ بنک سے ۷۰ پونڈ کا ایکسچینج بھی بروقت مل گیا لیکن عین وقت پر جو اڑنگا لگا وہ ٹکٹ کے سلسلے میں تھا۔ ہمارا ارادہ اپنا سفر سعودی عرب سے شروع کرنے اور سعودی عرب میں بھی خُبر (مشرقی ساحل کی بندرگاہ) کے راستے سے داخل ہونے کا تھا۔ یہ ہمیں پہلے سے معلوم تھا کہ حج کے دنوں کے سوا باقی ایام میں کراچی سے جدہ براہ راست کوئی جہاز نہیں جاتا، اور اگر کوئی جہاز جاتا بھی ہے تو سعودی حکومت کی طرف سے جدہ کے راستہ داخل ہونے کی اجازت نہیں دی جاتی۔ لیکن جب ہم نے خُبر جانے کے لیے جہاز ران کمپنی سے رجوع کیا تو معلوم ہوا کہ کراچی سے جو جہاز بصرہ جاتے ہیں وہ خُبر پر نہیں ٹھہرتے۔ اس لیے جن لوگوں کو کراچی سے خُبر جانا ہوتا ہے وہ پہلے بحرین اترتے ہیں اور پھر لانچ یا ہوائی جہاز کے ذریعے وہاں سے خُبر جاتے ہیں۔ اب گویا ہمیں بحرین کے ویزا کی ضرورت پیش آئی، اور نہ بحرین کا اندراج نہ مولانا کے پاسپورٹ میں تھا نہ میرے پاسپورٹ میں۔ خیال ہوا کہ شاید بحرین کا ٹرانزٹ ویزا اندراج کے بغیر ہی مل جائے۔

لیکن جب برطانوی ہائی کمشنر کے دفتر سے رجوع کیا تو معلوم ہوا کہ پاسپورٹ میں بحرین کا اندراج بہرحال ضروری ہے۔ اس روز اکتوبر کی ۲۶ تاریخ ہو چکی تھی اور اگلے روز جہاز روانہ ہو رہا تھا۔ ایک دن میں کسی طرح ممکن نہ تھا کہ پاسپورٹ میں بحرین کا اندراج بھی کرایا جائے، بحرین کا ویزا بھی لیا جائے اور پھر جہاز راں کمپنی سے ٹکٹ بھی۔ طوعاً و کرہاً سفر کا ارادہ ایک ہفتہ اور موخر کرنا پڑا۔

اگلے روز پاسپورٹ آفس میں بحرین کے اندراج کے لیے ہم نے اپنے پاسپورٹ داخل کیے۔ عام قاعدے کے مطابق تو ہمیں اپنے اپنے پاسپورٹ دس دن کے بعد ملتے، لیکن ہم نے ارجنٹ فیس ---دس روپے--- مزید ادا کی، تو ہمیں اگلے روز اپنے پاسپورٹ مل گئے۔ اس کے بعد پانچ دن فرصت ہی فرصت تھی۔ اس میں بحرین کا ویزا بھی لیا گیا اور ٹکٹ بھی۔ یہ بھی معلوم ہوا کہ پاکستان سے نکلنے سے پہلے حکومت پاکستان کی طرف سے ایک مزید اجازت حاصل کرنا اور پاسپورٹ پر ایک مہر لگوانا ضروری ہے۔ چنانچہ ان دنوں میں یہ مہم بھی سرانجام دی گئی۔ پاسپورٹ کا حصول اور پھر اپنے ملک سے نکلنے سے پہلے ویزا، ٹکٹ اور ایکسچینج کے لیے جو دوڑ دھوپ کی جاتی ہے وہ واقعی ایک زبردست مہم سے کم نہیں ہے۔ یہ اس زمانہ میں ہر ملک پر وطنی قومیت کا بھوت سوار ہونے کا نتیجہ ہے۔ گویا اپنے ملک سے نکلنے یا باہر سے اندر آنے والا ہر شخص ایک چور ہے جس کی ہر موقع پر سخت جانچ پڑتال کی جاتی ہے۔ ورنہ مسلمانوں کی اپنی حکومتوں کے درمیان ایک مسلمان کے لیے پاسپورٹ اور ویزا کا یہ چکر اسلامی نقطۂ نظر سے بالکل فضول اور غلط بات ہے۔ ساتویں صدی میں ابن بطوطہ مراکش سے چین تک گیا۔ محمد تغلق کے زمانہ میں وہ ہندوستان بھی آیا اور یہاں کئی سال تک مقیم رہا۔ یہاں اس نے شادی بھی کی اور قاضی کے عہدے پر بھی فائز رہا اور سفیر بنا کر بھیجا گیا، لیکن کسی موقع پر اسے پاسپورٹ اور ویزا کی ضرورت نہ پڑی۔

کراچی میں قیام کے دس دن اس دوڑ دھوپ کی نذر ہوئے یا پھر احباب و رفقاء سے ملاقاتیں رہیں اور ان کی مختلف دعوتوں میں شرکت۔ یہ تو اچھا ہوا کہ مولانا لاہور سے چلتے وقت اپنے ساتھ تفہیم القرآن کا کچھ کام لے آئے تھے، ورنہ معلوم ان کے یہ بے کاری کے دن کیونکر کٹتے۔ مولانا نے

تفہیم القرآن کی قسط (برائے ترجمان القرآن ماہ نومبر و دسمبر) ان ہی دنوں میں لکھی اور اپنے بعض ادھورے مضامین بھی مکمل کیے۔

کراچی سے بحرین (۳ تا ۸ نومبر) جہاز راں کمپنی کا اعلان تھا کہ اب اس کا آئندہ جہاز جس کا نام داریسا (DARISA) تھا، ۳ نومبر کی شام کراچی سے روانہ ہوگا۔ گن گن کر انتظار کے دن پورے ہوئے اور نومبر کی ۳ تاریخ پہنچ گئی۔ ہم نے اپنی ضرورت کی چیزیں سب خرید لی تھیں اور سامان تیار کر لیا تھا۔ دوسری ضروریات کے علاوہ مولانا کو پانوں کی بڑی فکر تھی، کیونکہ تمام عرب ممالک اللہ تعالیٰ کی اس نعمت سے محروم اور اکثر تو اس سے ناواقف بھی ہیں۔ اگرچہ جدہ میں ان کے مل جانے کی توقع تھی، لیکن جب تک ہم جدہ نہیں پہنچ جاتے، راستے کے لیے ان کی ایک اچھی خاصی مقدار کا یہیں سے لے جانا ضروری تھا۔ مولانا نے تین سو کے قریب پان منگوائے اور ایک خاص طریقہ سے انہیں کاٹ کر ٹوکری میں رکھا۔

مولانا کا ٹکٹ فسٹ کلاس کا تھا اور ان کا کیبن بھی ریزرو تھا، اس لیے انہیں وقت سے بہت زیادہ پہلے بندرگاہ پر پہنچنے کی ضرورت نہ تھی، لیکن میرا ٹکٹ "ڈیک" کا تھا اور مجھے ڈیک پر اپنی جگہ کے لیے جد و جہد کرنا تھی، اس لیے میں ۲ بجے کے قریب ہی بندرگاہ پہ پہنچ گیا۔ بعض دوست ساتھ تھے اور اکثر سے بندرگاہ پر ملاقات ہوئی جو مولانا سے ملاقات کے لیے اُن کی آمد کا انتظار کر رہے تھے۔ میرا خیال تھا کہ ان دنوں چونکہ عراق کی زیارتوں کا سلسلہ بند ہے اور عراق کے لیے لوگوں کو ویزا ابھی نہیں دیا جاتا، اس لیے جہاز کے لیے مسافروں کی بھیڑ بہت کم ہوگی لیکن جب میں بندرگاہ پہ پہنچا تو مسافروں کا بے پناہ ہجوم تھا۔ معلوم ہوا کہ کراچی سے جو لوگ پاکستان کی اپنی بندرگاہ گوادر جاتے ہیں، وہ اسی جہاز سے سفر کرتے ہیں اور ان ہی کی وجہ سے بھیڑ بھی تھی ایک لمبی لائن میں کھڑے ہو کر پہلے میں نے اپنے پاسپورٹ پر پولیس والوں کی مہر لگوائی۔ بحرین اترتے وقت پولیس والوں کو جو کارڈ پُر کر کے دینا ہوتا ہے، وہ بھی یہیں سے مل گیا۔ پھر سامان کی چیکنگ ہوئی بحری جہاز میں مسافروں پر سامان کے سلسلے میں گاڑی اور ہوائی جہاز کی طرح ایک مقررہ وزن کی

قید نہیں ہوتی، اس لیے میں نے اپنے دو بکس بھی مولانا ہی کے حوالے کر دیے تھے اور سیکنڈ کلاس والوں کے سامان کی چیکنگ بھی بڑی شرافت اور معقولیت سے کی جاتی ہے۔ یہ تو ڈیک کے مسافر ہی ہیں جن پر ہر قسم کی بے قاعدگی اور سمگلنگ کا شبہ کیا جاتا ہے اور ان کے سامان کی سختی سے تلاشی لی جاتی ہے۔ ہر جگہ غریب، پبلک، جمہور کا یہی حال ہے۔ اب میرے پاس صرف ایک بستر تھا اور ایک چھوٹا سا ہینڈ بیگ، اس لیے چیکنگ میں مجھے بھی کوئی پریشانی پیش نہیں آئی۔ چیکنگ کے بعد جہاز پر آیا تو وہاں کوئی جگہ ایسی نظر نہ آئی، جہاں اپنا بستر تک لگا سکوں۔ تلاش کے بعد ایک کونے میں جہاں کوئی سائبان تک نہیں تھا، اپنا بستر لگا لیا اور مولانا کی آمد کا انتظار کرنے لگا۔

۵ بجے کے قریب مولانا تشریف لائے۔ الحمد للہ سامان کی چیکنگ میں انہیں کوئی دقت پیش نہیں آئی اور ان کے پاسپورٹ پر پولیس والوں کی مہر بھی جہاز پر سوار ہونے کے ساتھ ہی لگی۔ احباب و رفقاء کی ایک کثیر تعداد تھی جس نے جہاز پر سوار ہوتے وقت مولانا کو الوداع کہی۔ ماہر القادری صاحب، خورشید صاحب، اور مولانا کے صاحبزادے احمد فاروق مولانا کے ساتھ جہاز کے اندر تک آئے۔ مولانا کے کیبن کا نمبر ۱ تھا، جس میں کوئی دوسرا مسافر ان کا شریک نہیں تھا۔ اس کا غسل خانہ اور بیت الخلاء بھی اس کے ساتھ ہی تھا۔ فسٹ کلاس کے عام کیبنوں میں یہ سہولت نہیں ہوتی۔ ہر کیبن میں کم از کم دو مسافر ہوتے ہیں اور بیت الخلاء اور غسل خانہ تو کئی کئی کیبنوں کا مشترک ہوتا ہے۔ اس لیے فسٹ کلاس کا ٹکٹ لینے پر بھی کسی شریف آدمی کو یہ اطمینان نہیں ہوتا کہ کسی رند بچار سے اس کا ساتھ نہیں ہو جائے گا۔

۶½ بجے کے قریب جہاز روانہ ہوا۔ دوسرے لوگ تو جہاز کی روانگی سے پہلے ہی جا چکے تھے۔ میں مولانا کے پاس رہا اور عشاء کے قریب اپنی جگہ پر آ گیا۔ آئندہ جتنے دن جہاز کا سفر رہا، مجھے بھی یہ سہولت رہی کہ دن میں جب ضرورت پڑتی، بلا کسی کے اعتراض کے بغیر مولانا کے پاس آ جاتا اور اکثر وہیں بیٹھ کر مطالعہ وغیرہ کرتا تھا۔ البتہ عشاء کے بعد اپنی جگہ آنا ضروری ہوتا تھا، کیونکہ رات کے وقت، جہاز والے ڈیک سے اوپر آنے کے تمام راستے بند کر دیتے ہیں۔

اگلے روز ۲ بجے کے قریب ہمارا جہاز پاکستان کی بندرگاہ گوادر پہنچا۔ یہاں چونکہ کوئی باقاعدہ بندرگاہ نہیں ہے، اس لیے جہاز خشکی سے ایک ڈیڑھ میل دور ٹھہرتا ہے اور لوگ کشتیوں کے ذریعے خشکی اور جہاز کے درمیان کا راستہ طے کرتے ہیں۔ جس وقت ہمارا جہاز وہاں پہنچا، سمندر میں قدرے تیز ہوا چل رہی تھی۔ اس تیز ہوا میں بادبانی کشتیوں کو جہاز تک پہنچنے کے لیے جس مصیبت کا سامنا کرنا پڑا، وہ دیکھنے سے تعلق رکھتی تھی۔ راستہ طے کرنے میں انہیں ایک گھنٹہ لگ گیا اور پھر سخت افراتفری کے عالم میں مسافر جہاز پر سوار ہوئے اور اترنے والے مسافر جہاز سے اُتر کر کشتیوں میں سوار ہوئے۔ اسے دیکھ کر مولانا فرمانے لگے کہ خدا کسی شریف آدمی کو یہاں نہ لائے۔

یہاں کے کسٹم آفیسر صاحب لاہور کے رہنے والے تھے، وہ بھی جہاز پر آئے۔ انہیں جب معلوم ہوا کہ مولانا اس جہاز سے سفر کر رہے ہیں تو وہ انہیں تلاش کرتے ہوئے اُن کے پاس پہنچے۔ انہوں نے بتایا کہ آج تو موسم پھر بھی غنیمت ہے، اس لیے مسافروں کو زیادہ پریشانی نہیں ہوئی، ورنہ جس دن موسم خراب ہو اور سمندر میں تیز ہوا چل رہی ہو تو یہاں بالکل قیامت کا سماں ہوتا ہے، خصوصاً گرمی کے موسم میں تو حالت بالکل ناگفتہ بہ ہوتی ہے۔ انہوں نے یہ بھی بتایا کہ چونکہ کراچی اور گوادر کے درمیان بحری جہاز کے سوا کوئی دوسرا معقول ذریعۂ آمد و رفت نہیں ہے، اس لیے مسافروں کی اچھی خاصی تعداد ہر جہاز سے اترتی اور اس میں سوار ہوتی ہے، لیکن ان کی سہولت کے لیے یہاں ایک بھی اچھی قسم کی کشتی نہیں ہے۔ صرف ایک لانچ ہے جس میں کسٹم کے عملہ کے لوگ آتے جاتے ہیں، باقی سب بادبانی کشتیاں ہیں جن کے لیے سمندر میں معمولی سی تیز مخالف ہوا کا مقابلہ کرنا بھی بڑا مشکل ہوتا ہے۔ خشکی کے راستہ سے اگر لوگ سفر کرنا چاہیں تو انہیں پہلے کراچی سے کوئٹہ آنا پڑتا ہے اور پھر کوئٹہ سے گوادر جو تقریباً چھ سو میل کا فاصلہ ہے اور اس میں نہ صرف یہ کہ کوئی پختہ بلکہ کوئی کچی سڑک بھی نہیں ہے۔ اس لیے یا تو مسافر پیدل چل کر یہ سارا راستہ طے کریں یا پھر اونٹوں کے ذریعے۔ کیا ہی اچھا ہو اگر یہاں گوادر میں دو چار

عمدہ قسم کی لانچوں کا انتظام کر دیا جائے تاکہ مسافروں کو جہاز اور بندرگاہ کے درمیان اس مصیبت کا سامنا نہ کرنا پڑے، جس کا سامنا انہیں اب کرنا پڑ رہا ہے۔

پاکستان کے قبضہ میں آنے سے پہلے گوادر سمگلنگ کا بہت ہی بڑا اڈہ تھا۔ جب پاکستان نے اس کا چارج لیا، تو پانچ کروڑ روپے کا صرف کپڑا یہاں موجود تھا حالانکہ دور سے دیکھنے میں یہ ایک معمولی سا گاؤں نظر آرہا تھا۔ کسٹم آفیسر صاحب نے یہ بھی بتایا کہ جن لوگوں کو پاکستان میں باہر جانے کے لیے پاسپورٹ نہیں ملتا، وہ گوادر کا ٹکٹ لیکر کراچی سے جہاز میں سوار ہو جاتے ہیں اور یہاں گوادر میں اُترنے کے بجائے جہاز میں چھپ جاتے ہیں۔ انہیں بڑی دقت سے تلاش کرنا پڑتا ہے اور اسی لیے یہاں اکثر جہاز لیٹ ہو جاتے ہیں۔ اسی تلاش میں ہمارا جہاز بھی لیٹ ہو گیا۔ اگر لوگوں کو پاسپورٹ کی سہولتیں حاصل ہوں، تو وہ اس قسم کی بے قاعدگیاں کیوں کریں۔

اگلے روز ۵ نومبر کو ہمارا جہاز مسقط، ۶ کو دبئی اور ۷ کو ریاست قطر کی بندرگاہ ام سعید پہنچا۔ یہ سب خلیج فارس کے عرب ساحل پر چھوٹی چھوٹی عرب ریاستیں ہیں، جن پر انگریزوں کا قبضہ ہے۔ انگریزوں نے اگرچہ بظاہر یہاں کٹ پتلیوں کی طرح شیوخ بٹھا رکھے ہیں، لیکن عملاً نظم و نسق کی کنجی ان کے اپنے ہاتھ میں ہے۔ شروع میں انگریزوں نے ان ریاستوں پر صرف اس لیے قبضہ جمایا تھا کہ خلیج فارس یعنی عراق و ہندوستان کے درمیان بحری راستہ پر ان کا قبضہ محفوظ رہے، لیکن جب سے ان ریاستوں میں پٹرول بھی نکل آیا ہے، انہوں نے پوری طاقت سے ان پر اپنے پنجے گاڑ دیئے ہیں۔

مسقط، دبئی اور ام سعید اگرچہ بڑی بندرگاہیں نہیں ہیں اور یہاں بھی جہاز خشکی سے دُور ہی ٹھہرتا ہے، لیکن یہاں لانچوں کی وجہ سے مسافروں کو اترنے چڑھنے میں اس قسم کی دقت پیش نہیں آتی جس قسم کی گوادر میں ہم نے دیکھی۔

جس وقت ہمارا جہاز مسقط پہنچا، میں اوپر مولانا کے پاس تھا۔ جہاز کے چلنے کے بعد

جب میں نیچے اپنی جگہ پر آیا تو معلوم ہوا کہ مسقط کے کچھ دکاندار جہاز کے اندر آ گئے تھے اور انہوں نے یہاں باقاعدہ بازار لگایا اور لوگوں نے خوب خوب چیزیں خریدیں۔ پاکستان کا نوٹ یہاں نہیں چلتا، ہندوستانی نوٹ چلتا ہے اور وہ بھی وہ ہندوستانی نوٹ جو ہندوستان نے خاص طور پر خلیج فارس کی ریاستوں کے لیے تیار کیا ہے۔ پاکستان کے نوٹ کی قیمت اگرچہ سرکاری طور پر اس کے برابر ہے، لیکن جہاز کے بازار میں پاکستانی نوٹ کی قیمت اس کے مقابلے میں ۲/۳ رہی۔ پھر اسی قسم کا بازار آگے چل کر دبئی اور ام سعید پر بھی لگا، بلکہ بعض دکانداروں نے تو جو در اصل مسافر تھے مستقل دکانیں جما لیں، جو چلتے جہاز میں بھی لگی رہیں۔ کپڑا، جوتے، بسکٹ، قلم الغرض ضرورت کی عام چیزوں میں کوئی ایسی نہ تھی جو اس بازار میں نہ ملتی ہو اور وہ بھی نہایت سستے داموں۔ ایک جاپانی چپل کی قیمت میں نے دریافت کی تو دکاندار نے دو روپے بتائی، حالانکہ اسی چپل کی قیمت لاہور و کراچی میں دس روپے کے قریب ہے۔ یہی حال کپڑے اور دوسری چیزوں کا بھی تھا۔

ہمارا یہ جہاز صرف سواری کا جہاز نہ تھا بلکہ سواری اور مال دونوں کا ملا جلا جہاز تھا، اسی لیے ہر بندرگاہ پر ٹھہرتا اور وہاں مسافروں کے علاوہ تجارتی سامان اتارنے اور چڑھانے کی وجہ سے کئی کئی گھنٹے رکا رہتا تھا۔ ام سعید پر جو سامان اترا ہم نے دیکھا کہ اس میں بڑی تعداد بوریوں میں بند خشک گوشت کی تھی جو غالباً آسٹریلیا سے مشینوں کے ذریعے کٹ کر آیا ہوگا۔ افسوس اہل عرب اس معاملہ میں بالکل بے حس ہو گئے ہیں۔

معلوم ہوا کہ جہاز میں شراب خوب پی جاتی ہے، خصوصاً فسٹ اور سیکنڈ کلاس کے مسافر تو گویا شراب پینے اور رنگ رلیاں منانے ہی کے لیے سفر کرتے ہیں۔ رات کے وقت جسے دیکھیے اس کے منہ سے شراب کی بو آ رہی ہے۔ جہاز کے عملہ کے ایک آدمی نے بتایا کہ کراچی میں جو لوگ جہاز پر آئے تھے، ان میں سے اکثر یہاں شراب پی کر گئے۔ جہاز پر شراب سستی بھی ملتی ہے اور اس کے لیے یہاں ڈاکٹری سرٹیفکیٹ تک کی بھی ضرورت نہیں پڑتی۔ تو آخر پینے والے اسے کیوں نہ پئیں؟

ہمارے اسی جہاز میں ضلع گجرات کے ایک مولوی صاحب کراچی سے بحرین جارہے تھے۔ بحرین سے انہیں ہماری ہی طرح خُبر جانا تھا اور پھر عمرہ کے لیے مکہ معظمہ۔ سیکنڈ کلاس میں سفر کر رہے تھے لیکن اپنے کیبن میں مشکل ہی سے ٹھہر سکتے تھے، کیونکہ کیبن میں دوسرے مسافروں کی شراب نوشی کی وجہ سے ان کا اپنے کیبن میں بیٹھنا بہت مشکل تھا۔

جہاز میں کھانا دو طرز کا ہوتا ہے، انگریزی طرز کا اور ہندوستانی طرز کا بھی، اور پھر ہر کھانے کے فسٹ، سیکنڈ اور تھرڈ تین درجے ہوتے ہیں۔ ہندوستانی کھانے میں مسلم و غیر مسلم کی تفریق بھی ہوتی ہے، لیکن جہاز والوں کا سارا اہتمام گویا انگریزی طرز کے کھانے کے لیے ہوتا ہے۔ اس کے تیسرے درجے کا کھانا بھی ہندوستانی طرز کے اول درجے کے کھانے سے بہتر ہوتا ہے لیکن اس میں گوشت کے مشکوک ہونے کی وجہ سے کسی محتاط مسلمان کا اس میں شریک ہونا مشکل ہے۔ مولانا نے ہندوستانی طرز کے کھانے ہی کو ترجیح دی۔ یہ کھانا اگرچہ فسٹ کلاس کا تھا اور مولانا نے اس کی اجرت غالباً سو روپے سے زیادہ ہی ادا کی ہو گی، لیکن یہ نہایت ناقص قسم کا تھا، بالکل ہندوؤں کے طرز کا بنا ہوا۔ اس میں گھی بھی ردی قسم کا تھا۔ اس لیے مولانا چند وقت سے زیادہ اسے نہ نبھا سکے اور جہاز کی صاف اور کھلی فضا کے باوجود سفر کے آخری تین چار دن بس برائے نام ہی کھاتے رہے۔ ڈیک کے مسافروں کا ٹکٹ دونوں طرح کا ہوتا ہے۔ کھانے سمیت بھی اور کھانے کے بغیر بھی۔ جو لوگ کھانے کے بغیر ٹکٹ لیتے ہیں، انہیں اپنے کھانے کا اہتمام خود کرنا پڑتا ہے، اور جو لوگ ٹکٹ کے ساتھ کھانے کی قیمت بھی ادا کرتے ہیں انہیں جہاز پر کھانا لنگر میں جا کر کھانا پڑتا ہے۔ پہلے سفر کی وجہ سے مجھے ڈیک کے اس کھانے کا حال معلوم تھا، اس لیے میں نے اپنا ٹکٹ کھانے کے بغیر ہی لے لیا تھا۔ جہاز پر پہنچ کر میں نے کچن کے مسلم منیجر کو چالیس روپے ادا کر کے فسٹ کلاس کے ہندوستانی طرز کے کھانے کا ٹکٹ بنوا لیا جو ایک تو میری اپنی جگہ پر آجاتا تھا اور دوسرے بہر حال اس قابل تھا کہ میرے جیسا آدمی اسے نبھا سکتا تھا۔

موسم غنیمت تھا اور سمندر میں بھی تلاطم نہیں تھا، اس لیے جہاز پر متلی یا سر میں گھمیری کی شکایت سے ہم لوگ بڑی حد تک محفوظ رہے۔ مولانا تو الحمد للہ بالکل محفوظ رہے مجھے ایک دن سر میں ہلکی سی گھمیری محسوس ہوئی لیکن وہ لیموں کا اچار کھا لینے سے دُور ہو گئی، ورنہ مجھے یاد ہے کہ ۱۹۴۹ء میں جب میں نے مولانا مسعود عالم ندوی مرحوم کے ساتھ گرمی کے موسم میں کراچی سے بصرہ کا سفر کیا تھا تو متلی اور دورانِ سر کی وجہ سے میرا بُرا حال ہوا تھا۔

بحرین (۸ تا ۱۰ نومبر) ۸ نومبر کی صبح ۷ بجے کے قریب ہمارا جہاز بحرین پہنچ گیا بحرین خلیج فارس میں ایک بڑے اور دو چھوٹے جزیروں کے مجموعہ کا نام ہے، یوں صرف بڑے جزیرے کو بھی بحرین کہہ دیتے ہیں۔ اس بڑے جزیرے میں مَنَامَہ نامی ایک ہی شہر ہے اور وہی بندرگاہ بھی ہے اور یہیں ہمارا جہاز بھی رُکا۔ اس کے قریب سمندر میں دُور تک پانی بہت ہی اوتھلا ہے اس لیے ہمارا جہاز بندرگاہ سے تقریباً ۴ میل دُور ٹھہرا۔ ۹ بجے کے قریب ہم جہاز سے اُتر کر لانچ میں سوار ہوئے۔ لانچ والے نے بندرگاہ تک پہنچانے کی اُجرت پانچ روپے فی کس وصول کی۔ ۱۱½ بجے کے قریب ہم بندرگاہ پہنچ گئے۔

جب تک ہم لانچ پر تھے، ہمارا خیال تھا کہ یہاں بحرین میں ہمیں جاننے والا کوئی شخص نہیں ہے۔ اس لیے ہم یہاں صرف چند گھنٹے ٹھہریں گے اور اس کے بعد لانچ یا ہوائی جہاز سے خُبَر (سعودی عرب) روانہ ہو جائیں گے۔ لیکن جب لانچ خشکی کے قریب پہنچا تو جو لوگ مسافروں کو لینے کے لیے بندرگاہ پر آئے ہوتے تھے اُن میں چند صورتیں ہمیں ایسی دکھائی دیں جن کی نگاہیں گویا لانچ کے مسافروں میں ہمیں تلاش کر رہی تھیں۔ جب ہم لانچ سے اترے تو تین آدمیوں نے، جن میں سے ایک پاکستانی لباس میں تھے اور باقی دو عربی لباس میں، بڑھ کر ہم سے مصافحہ کیا۔ تعارف پر معلوم ہوا کہ جو صاحب پاکستانی لباس میں ہیں وہ ضلع ہزارہ کے رہنے والے ہیں اور عرصہ ڈیڑھ دو سال سے یہاں بحرین کے ایک پرائمری سکول (جس میں تمام بچے ہندوستانی و پاکستانی ہیں) کے ایک ہیڈ ماسٹر ہیں۔ اور ان کے دوسرے دو ساتھی یہیں بحرین کے

رہنے والے ہیں۔ جب ہم نے ان سے دریافت کیا کہ آپ لوگوں کو ہمارے آنے کی اطلاع کیسے ہوئی، تو انہوں نے بتایا کہ خُبَر اور ظہران (سعودی عرب) میں بعض لوگوں کو آپ کے آنے کی اطلاع کراچی سے ہو گئی تھی۔ انہوں نے نہ صرف یہ کہ ہمیں اطلاع دی بلکہ ایک صاحب کو خاص طور پر آپ کو لینے کے لیے یہاں بھیجا ہے اور اس وقت یہ صاحب آپ کا استقبال جہاز ہی پر کرنے کے خیال سے ایک بحرینی دوست کے ساتھ جہاز تک گئے ہوتے ہیں۔" ہم یہ باتیں کر ہی رہے تھے کہ اگلی لانچ سے یہ دونوں صاحب بھی آگئے۔ جو صاحب ظہران سے آئے تھے وہ پاکستانی تھے اور ان کا نام اسماعیل خاں تھا۔ یہ بھی ضلع ہزارہ کے رہنے والے اور گزشتہ ۸ سال سے عرب امریکن تیل کمپنی (ارامکو) میں ملازمت کی وجہ سے ظہران میں مقیم تھے۔

جہاز سے اترتے وقت ہمیں اپنے پاسپورٹوں پر بحرین میں داخلے کی مہر لگوانی چاہیے تھی لیکن ہم اپنی ناواقفیت اور بے جا جلدی کی وجہ سے یہ مہر نہ لگوا سکے۔ اب اگر ہمارے جاننے والے یہ لوگ بندرگاہ پر موجود نہ ہوتے تو ہمیں بڑی پریشانی ہوتی، لیکن الحمدللہ ان کی وجہ سے کوئی پریشانی نہیں ہوئی اور ان کے تعلقات کی وجہ سے یہ مہر وہیں لگ گئی۔ ہمارے سامان کی بھی گویا کوئی چیکنگ نہیں ہوئی اور اس طرح چند منٹوں سے زیادہ بندرگاہ پر ہمارا وقت ضائع نہیں ہوا۔

اس کے بعد ہم ایک ہوٹل "فندق البحرین" (جس کا مالک ایک ایرانی تھا) پہنچے۔ منامہ بہت ہی خوب صورت شہر نظر آرہا تھا، سڑکیں نہایت عمدہ تھیں اور تمام عمارتیں جدید طرز کی بنی ہوئی تھیں۔ اسماعیل خاں صاحب نے پہلے ہی سے ہمارے لیے ہوٹل میں ایک کمرہ لے رکھا تھا۔ ہم نے اس میں اپنا سامان رکھوایا اور کپڑے بدلے۔ اس کے بعد ملاقات کے لیے آنے والوں کا سلسلہ شروع ہوا۔ ان میں سے کچھ تو پاکستانی تھے اور زیادہ تر بحرین ہی کے رہنے والے تھے جنہوں نے مولانا کی عربی کتابیں یا المسلمون اور دوسرے عربی پرچوں میں ان کے مضامین پڑھے ہوئے تھے اور غائبانہ طور پر وہ مولانا سے اچھی طرح واقف تھے۔ دوپہر کا کھانا ہمارے پاکستانی دوست (جنہوں نے بندرگاہ پر ہمارا استقبال کیا تھا) اپنے گھر سے لے آئے معلوم ہوا

کہ ان کا گھر ہوٹل سے دس بارہ میل کے فاصلے پر ہے۔ اگر ہمیں یہ پہلے سے معلوم ہوتا تو نہیں اس قدر تکلف میں پڑنے کی اجازت نہ دیتے اور یہیں بازار سے کھانے کا کوئی انتظام کر لیتے اگرچہ ہمارا جی یہی چاہتا تھا کہ کم از کم آج کا کھانا اگر کوئی صاحب گھر سے لانے کی پیش کش کریں تو دل کی تمنا بر آئے، کیونکہ لگاتار کئی دن تک جہاز کا ایک ہی قسم کا کھانا کھاتے ہم بازاری کھانے "سے" اکتا گئے تھے۔ ہمارے علاوہ آٹھ دس آدمیوں نے مل کر یہ کھانا کھایا۔ کھانا پاکستانی طرز کا تھا اگرچہ کچھ عربی اثر لیے ہوئے۔ عربی اثر سے مراد یہ کہ اس میں مرچ بہت کم تھی، لیکن ہمارے بعض بحرینی دوستوں پر یہ بھی کچھ سخت ہی گزری۔ عرب ممالک میں لوگ سُرخ مرچ بالکل استعمال نہیں کرتے۔ بحرین میں ہند و پاکستان سے قربت کی وجہ سے کچھ لوگ اس کا استعمال کر لیتے ہیں لیکن عام باشندوں کا حال دوسرے عرب ممالک جیسا ہی ہے۔ اس پر دوسرا عربی اثر یہ تھا کہ اگرچہ یہ دو یا تین آدمیوں کے لیے تھا لیکن اس کی مقدار اتنی تھی کہ دس بارہ آدمیوں نے اسے خوب سیر ہو کر کھایا۔ عربوں کے ہاں یہ بڑی معیوب بات سمجھی جاتی ہے کہ مہمانوں کے سامنے کھانا ان کی تعداد کے مطابق رکھا جائے، بلکہ مہمانوں کی عزت افزائی اس میں ہے کہ کھانا ان کی تعداد سے بہت زیادہ ہو، تاکہ وہ جسے چاہیں اپنے ساتھ شامل کر سکیں۔

کھانے کے بعد ہم نے ان لوگوں سے اگلے روز خُبر روانہ ہو جانے کی اجازت چاہی، مگر ان لوگوں نے کم از کم ایک ہفتہ بحرین میں ٹھہرنے پر اصرار کیا۔ اپنے طور پر ان لوگوں نے ہماری ہفتہ بھر کی ملاقاتوں اور دوسری مصروفیتوں کا پروگرام بھی بنا رکھا تھا، لیکن ہمارے پاس وقت چونکہ کم تھا، اس لیے بالآخر یہ طے پایا کہ ہم دو دن ٹھیر کر ۱۰ نومبر کو خُبر روانہ ہو جائیں گے۔

مغرب تک ہم لوگ ہوٹل ہی میں رہے اور ملاقات کے لیے آنے والوں کا سلسلہ جاری رہا۔ رات کو المحرّق (بحرین کا دوسرا چھوٹا جزیرہ جو منامہ سے ایک ایسے پل کے ذریعے ملا ہوا ہے جو جہازوں کے گزرنے کے لیے اٹھا دیا جاتا ہے اور دوسرے اوقات میں لگا رہتا ہے)

میں ایک عرب دوست کے ہاں کھانے کی دعوت تھی۔ مغرب کے بعد چند دوستوں کے ساتھ وہاں پہنچے، وہاں پندرہ کے قریب سنجیدہ اور پڑھے لکھے نوجوان موجود تھے جنہوں نے بڑی گرمجوشی اور محبت سے مولانا کا استقبال کیا۔ پھر تعارف ہوا۔ عشا کی نماز ہم نے ان کے ساتھ پڑھی۔ پھر کھانا کھایا۔ کھانے پر عربی تہذیب اور عربی ذوق غالب تھا۔ دستر خوان پر کئی طرح کے کھانے رکھے ہوئے تھے، لیکن کسی میں سرخ مرچ نہ تھی۔ گویا اس سفر میں آج ہماری بلا مرچ کا کھانا کھانے کی ابتدا ہو رہی تھی۔ ویسے ان لوگوں نے ہمارے ہند و پاکستانی ذوق کا بھی لحاظ رکھا اور وہ اس طرح کہ ہمارے سامنے ایک چھوٹی پلیٹ میں پسی ہوئی مرچ رکھ دی، تاکہ ہم اپنے طور پر جس کھانے پر چاہیں اسے ڈال کر کھاتے رہیں۔ تمام کھانے بڑے اہتمام اور تکلف سے تیار کیے گئے تھے اور ہمارے بحرینی دوست خوب مزا لے لے کر انہیں کھا رہے تھے، لیکن مرچ نہ ہونے کی وجہ سے ہمیں کسی کھانے میں مزا نہ آ رہا تھا۔ ہم یہ سوچتے ہی رہے کہ آخر یہ لوگ مرچ کے بغیر کیسے کھانا کھا لیتے ہیں۔ بہرحال جہاں تک ہو سکا، ہم نے پسی ہوئی مرچ سے پھیکے پن کی تلافی کرنے کی کوشش کی۔ کھانے کے بعد چائے آئی اور وہ دودھ کے بغیر۔ گزشتہ سفر میں بھی ہمیں دودھ کے بغیر چائے سے سابقہ پیش آ رہا تھا، لیکن ہم اکثر موقعوں پر یا تو معذرت کرتے رہے تھے یا جہاں بے تکلفی ہوتی تھی وہاں دودھ طلب کر لیا کرتے تھے، لیکن یہاں معذرت کرنا اچھا معلوم نہ ہوا۔ عرب ملکوں کے لوگ چائے میں دودھ ڈالنا جانتے ہی نہیں۔ اور پھر ان ملکوں میں اس کثرت سے چائے پی جاتی ہے کہ ہمارے ہاں بہت کم لوگ دودھ کے ساتھ بھی اتنی چائے پی سکتے ہیں۔ تعجب یہ کہ جو ملک زیادہ گرم ہیں وہاں زیادہ چائے پی جاتی ہے۔ عراق کے لوگوں میں سے ہر شخص ہر روز پندرہ بیس پیالیاں چائے پی جاتا ہے اور پھر ان کی چائے بھی اس قدر سیاہ اور سخت ہوتی ہے کہ اگر میرے جیسا آدمی صبح کے وقت ایک پیالی پی لے، تو رات تک سر کو لے کر پڑا رہے۔ عراق کے بعد دوسرا نمبر حجاز اور پھر دوسرے ممالک کا ہے۔ شام ایک ایسا ملک ہے جہاں کی آب و ہوا

اگرچہ نہایت ٹھنڈی ہے۔ لیکن وہاں لوگوں کو چائے پینے کی بہت کم عادت ہے اور مقدار کی کمی کے علاوہ ان کی چائے بھی اتنی ہلکی ہوتی ہے کہ عراق والے کہتے ہیں کہ ایسی چائے تو ہم اپنے بچوں کو دیتے ہیں، اسی لیے شام کے لوگوں کی صحت بہت عمدہ ہے۔

کھانے سے فارغ ہونے کے بعد سب لوگ ایک بڑے کمرے میں بیٹھ گئے دوسرے لوگوں کے آنے کا سلسلہ بھی جاری رہا۔ ان لوگوں کا پروگرام یہ تھا کہ لوگ مختلف موضوعوں پر مولانا سے سوالات کریں اور مولانا ان کے جوابات دیں۔ سوالات عام طور پر پاکستان، ہندوستان اور کشمیر میں مسلمانوں کی حالت کے متعلق تھے۔ یا یہ کہ اس زمانہ میں دعوتِ اسلامی کا کام کیسے کیا جاتے۔ ایک چیز جوان سوالات سے ظاہر ہوتی تھی وہ یہ کہ ان لوگوں میں چونکہ اپنے ہاں کے حالات کو دیکھ کر خیر پر شر کے غلبہ کا احساس بہت زیادہ ہے اور وہ یہ بھی پوری طرح سمجھتے ہیں کہ کس طرح وہ پورے عالمِ اسلامی سے کٹ گئے ہیں، اس لیے ان میں اسلام کے لیے کام کرنے کا جذبہ بہت ہے۔ یہ صرف اس تلاش میں رہتے ہیں کہ کوئی ان کو سیدھے راستے پر ڈال دے، اسی لیے یہاں اگر کسی عالمِ دین کا گذر ہو جاتا ہے تو ان لوگوں کے لیے وہ بڑی ہی نعمتِ غیر مترقبہ ہوتی ہے۔ مولانا ان کے سوالات کا اطمینان اور تفصیل سے جواب دیتے رہے۔ ہندوستان کے مسلمانوں کے متعلق مولانا نے بتایا کہ ان کی حالت ویسی ہی ہے جیسے اسرائیل میں عربوں کی۔ یہ مختصر جواب نہایت مؤثر رہا۔ اس مثال کے بغیر اگر ہندوستان میں مسلمانوں کی حالت کے متعلق کوئی مفصل تقریر بھی کرتے تو شاید وہ اتنی مؤثر نہ ہوتی۔ بعض لوگوں نے پاکستان کے موجودہ سیاسی مسائل کے متعلق بھی سوالات کیے۔ لیکن مولانا نے ان سوالات کا جواب نہیں دیا اور فرمایا کہ میں پاکستانی سیاسیات کو کراچی کے ساحل پر بطورِ امانت رکھ آیا ہوں اور جب واپس جاؤں گا تو اسے وصول کر لوں گا، اس لیے آپ لوگ اس کے متعلق مجھ سے سوالات نہ کریں۔ بعض سوالات سے اندازہ ہوا کہ یہاں بحرین میں چند تبلیغی جماعت سے متاثر حضرات بھی رہتے ہیں، جن کی باتوں سے بعض لوگوں میں یہ غلط فہمی پیدا ہو گئی ہے کہ مولانا مودودی اور

تبلیغی جماعت کے درمیان کچھ بڑے اختلافات ہیں۔ "الفرقان" کے مضامین بھی اس خیال کو تقویت دینے کا سبب بنتے تھے۔ اس سلسلہ میں بعض سوالات کا جواب دیتے ہوئے مولانا نے فرمایا کہ ہمارے اور تبلیغی جماعت کے درمیان کوئی کشمکش یا مخالفت نہیں ہے دین کا کام وہ اپنی سمجھ اور طریق کار کے مطابق کر رہے ہیں اور ہم اپنی سمجھ اور طریق کار کے مطابق اس زمانہ میں باطل کا اس قدر غلبہ ہو چکا ہے کہ دو چار جماعتیں تو درکنار، اگر ایسی سینکڑوں جماعتیں بھی دین کا کام کرنے کے لیے میدان میں اتر آئیں تو وہ بھی کم ہیں اس لیے ایسی جماعتوں کے درمیان مخاصمت کی کوئی وجہ نہیں ہے۔ مخاصمت تو ان لوگوں کے درمیان ہوتی ہے جن کی ذہنیت دکانداروں جیسی ہوتی ہے اور وہ کوئی کام اللہ کی خوشنودی کے لیے نہیں بلکہ اپنے ذاتی مفاد اور ناموری کے لیے کرنا چاہتے ہیں۔ مولانا نے ان لوگوں کو تلقین کی کہ اس زمانہ میں جو لوگ بھی دین کا کام کر رہے ہیں، آپ ان سب کا لٹریچر پڑھیے ان کا کام دیکھیے، پھر جدھر اطمینان ہو جا کر خلوص کے ساتھ دین کی خدمت کیجیے، اور خواہ مخواہ دوسرے خادمانِ دین سے نہ الجھیے۔

سوالات کا سلسلہ تقریباً دو گھنٹے تک جاری رہا۔ ۱۲ بجے کے قریب لوگوں نے خود ہی محسوس کیا کہ مولانا چونکہ آج ہی سفر سے آ رہے ہیں، اور بہت تھکے ہوتے ہونگے اس لیے انہیں آرام کرنے دیا جاتے چنانچہ اس کے بعد ہم اپنے ہوٹل آ گئے۔

اگلے روز دوپہر تک ہم بازار میں اپنے لیے سفر سے متعلق ضروریات کی خرید و فروخت میں مصروف رہے۔ تمام بازار نہایت پُررونق اور بیرونی سامان (خصوصاً انگلستان اور جاپان سے برآمد شدہ) سے بھرے ہوئے تھے، ضروریات تو ضروریات سامانِ تعیش میں سے بھی کوئی چیز ایسی نہ ہوگی، جو وہاں موجود نہ ہو اور قیمتیں بعض اوقات حیرت انگیز حد تک سستی۔ سنا ہے کہ یہاں بحرین میں باہر سے آنے والے سامان پر صرف دو فی صدی ڈیوٹی ہے، جبکہ یہ ڈیوٹی سعودی عرب میں بھی ۱۰ فی صدی ہے۔ اس لیے یہاں سعودی

عرب سے بھی بڑھکر ارزانی ہے۔ ہمارے دوست اسماعیل خاں صاحب نے بتایا (اور بعد میں ظہران پہنچ کر خود ہمیں بھی اس کا تجربہ ہو گیا) کہ جس چیز کی قیمت یہاں بحرین میں ایک روپیہ ہے اس کی قیمت خُبَر اور ظہران میں کم از کم ڈیڑھ روپیہ اور مکہ معظمہ و جدہ میں سوا روپیہ کے قریب ہے' اس لیے سعودی عرب سے بھی جو لوگ بحرین آتے یا بحرین سے گزرتے ہیں وہ اپنی ضرورت کی تمام چیزیں یہیں سے خریدتے ہیں۔

بازاروں میں عورتیں بہت کم نظر آئیں اور جو نظر آئیں وہ زیادہ تر برقع اوڑھے ہوئے تھیں۔ سُنا ہے کہ یہاں کی عورتوں میں ابھی بے پردگی نہیں ہے، البتہ بعض عورتیں جنہیں ذرا روشنی لگ گئی ہے وہ جھلملی شفاف سیاہ نقاب ڈالنے لگی ہیں جس سے چہرہ صاف نظر آتا ہے۔ باقی سب موٹا نقاب ڈالتی ہیں۔ لیکن اب شامی، لبنانی اور مصری خواتین کے طفیل یاں لباس میں مغربیت آ رہی ہے اور اونچے طبقے کی عورتیں تمام حیثیتوں سے میم صاحبہ بن گئی ہیں۔ مردوں میں بھی سوٹ پہنے ہوئے لوگ ہمیں بہت کم نظر آتے۔ اگر سب نہیں تو زیادہ تر لوگ اپنے اسی لمبے کرتے اور سر پر رومال کے ساتھ بازاروں میں پھر رہے تھے۔ یہی حال دکانداروں اور دفتروں کے ملازمین کا بھی تھا۔ سنا ہے یہ لوگ جو بھی بانکا پن اور فیشن پرستی کرنا چاہتے ہیں وہ اپنے اسی لباس میں کرتے ہیں۔ مثلاً نوجوان قسم کے لوگوں کے کُرتے ہم نے زیادہ تر ریشم کے اور ان کے سروں کے رومال نہایت باریک چکن کے دیکھے۔ شوقین قسم کے لوگ اس لمبے کرتے پر کوٹ بھی پہنتے ہیں، جو ہم لوگوں کو پہلی نظر میں بہت ہی عجیب معلوم ہوتا ہے۔ بہر حال خوشی ہے کہ یہ لوگ ابھی تک کم از کم لباس میں مغربی تہذیب سے بچے ہوئے ہیں، اگرچہ ان کے لمبے لمبے کرتے دیکھ کر مولانا تعجب کرتے رہے کہ معلوم نہیں یہ لوگ ان کرتوں کے ساتھ کام کیونکر کرتے ہیں۔ ان کی عورتوں کے برقعے بھی عجیب طرز کے ہیں۔ بہت ہی بھاری ہیں۔ اور ناک پر ایک قسم کا لگام سا لگا ہوا ہے۔ ایک دن مولانا نے فرمایا، عربوں کا بھی عجب حال ہے، ان کے پاس یا تو اپنا یہ پرانا لباس ہے جسے اس زمانہ میں بہر حال نہیں نبھایا جا سکتا، یا پھر یہ لوگ

چھوٹتے ہی مغربی لباس کی طرف لپک پڑے ہیں۔ ہمارے ہاں چونکہ لباس میں زمانہ کی رفتار کے ساتھ برابر ترمیم ہوتی رہی ہے، اس لیے ہمارے ہاں کے لوگ اسے نبھا سکتے ہیں اور اس زمانہ میں بھی نبھاتے چلے جا رہے ہیں۔

شام کے وقت ہم یہاں کے آثار دیکھنے کے لیے نکلے۔ منامہ سے تین میل کے فاصلہ پر پرتگیزوں کا بنایا ہوا ایک قلعہ ہے جو غالباً انہوں نے چودھویں صدی عیسوی میں تعمیر کیا ہوگا جبکہ وہ خلیج فارس میں عربوں کو بے دخل کرتے پھر رہے تھے۔ اب تو اس قلعہ کے صرف کھنڈر پائے جاتے ہیں، اصل قلعہ منہدم ہو چکا ہے۔ اس قلعہ کے ساتھ ایک دار الآثار بھی ہے، لیکن اس میں سوائے نام کے کوئی چیز نہیں ہے۔ سنا ہے آج سے چند سال پیشتر ڈنمارک کے محکمہ آثارِ قدیمہ کی ایک جماعت اس قلعہ کے متعلق معلومات جمع کرنے کے لیے یہاں آئی تھی۔ اس نے جب قلعہ کے اندر اور باہر کھدائی کی تو اسے قلعہ کے ساتھ فنیقیوں کے زمانہ کا ایک مدفون گاؤں ملا۔

قلعہ کے راستہ میں ایک مسجد آئی جس کے متعلق وہاں کے لوگوں نے ہمیں بتایا کہ یہ حضرت خالد بن ولید کے زمانہ کی مسجد ہے۔ معلوم نہیں یہ مقامی روایت کہاں تک صحیح ہے؟ واپسی میں قلعہ کے قریب ہم نے ایک جگہ دیکھی، جسے وہاں کے لوگ یاکور کہتے ہیں۔ یہ نخلستان کے اندر کھجور کی جھونپڑیوں پر مشتمل ایک بستی ہے۔ گرمی کے موسم میں جب شہر کے پختہ مکانات بہت تپنا شروع ہو جاتے ہیں، تو لوگ شہر چھوڑ کر یہاں چلے آتے ہیں اور گرمی کے سخت دن یہیں گزارتے ہیں۔

مغرب کے بعد ہم اپنے پاکستانی دوست کے ہاں گئے۔ وہاں اور بھی بہت سے عرب اور پاکستانی حضرات موجود تھے۔ کھانا کھایا، عشا کی نماز پڑھی اور پھر وہی سوال و جواب کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ آج کے تمام سوالات صرف ایک موضوع کے متعلق تھے اور وہ یہ کہ اس زمانہ میں دعوتِ اسلامی کا کام کیونکر کیا جائے۔ آج کے یہ سوالات کل کی نسبت زیادہ سنجیدہ اور علمی انداز لیے ہوئے تھے، اور جو لوگ سوالات کر رہے تھے وہ بھی کل کے لوگوں کی نسبت زیادہ پڑھے لکھے، سنجیدہ اور کام کا جذبہ رکھنے والے تھے، اگرچہ ان میں اکثر مایوسی کا شکار نظر

آرہے تھے۔ مولانا کے جوابات سے یہ لوگ بڑی حد تک مطمئن ہو گئے۔ یہ سلسلہ رات کے ایک بجے تک جاری رہا اور اس کے بعد ہم اپنے ہوٹل آ گئے۔

بحرین جیسا کہ میں پہلے عرض کر چکا ہوں، تین چھوٹے چھوٹے جزیروں کے مجموعہ کا نام ہے جن کا کل رقبہ ۴۰۰ مربع میل ہے۔ ان میں بڑا جزیرہ ۲۵ میل لمبا اور تقریباً ۱۲ میل چوڑا ہے اور اس کی کل آبادی ایک لاکھ ستر ہزار ہے۔ سارا جزیرہ میدان ہے اور یہاں کوئی اونچا پہاڑ نہیں ہے۔ صرف ایک ٹیلا ہے جو یہاں کا سب سے اونچا پہاڑ کہلاتا ہے۔ اس کا نام جبل الدخان ہے اور اس کی کل اونچائی ۴۵۰ فٹ ہے۔ آج سے دس سال پیشتر تک بحرین میں کھجور کے سوا کوئی چیز پیدا نہیں ہوتی تھی، اور یہ ایک چھوٹی سی غریب ریاست تھی، لیکن پٹرول نکل آنے کے بعد یہاں کی قسمت ہی بدل گئی ہے۔ اب سنا ہے کہ یہاں پٹرول کے کل ۲۲۰ کنوئیں ہیں۔

آبادی میں عراق کی طرح شیعہ اور سُنی تقریباً برابر ہیں، خصوصاً دیہات میں زیادہ آبادی شیعوں کی ہے۔ تجارت کا بھی بڑا حصہ شیعہ تاجروں کے ہاتھ میں ہے اور شیعوں کا رجحان ایران کی طرف ہے۔ اس چیز کا ایران کے اس دعوے میں جو وہ بحرین کے متعلق رکھتا ہے، بڑا دخل ہے۔ خود فارسی بولنے والوں کی تعداد یہاں بھی اچھی خاصی ہے، جو سب کے سب شیعہ ہیں اور غالباً ایران کے زمانۂ تسلط میں یہاں آکر آباد ہو گئے ہیں۔ خصوصاً ہوٹلوں کے مالک اور مزدور تو سب کے سب یہی لوگ ہیں۔

اہلِ سنت میں اکثریت شافعیہ کی ہے، لیکن سرکاری مذہب مالکی ہے، کیونکہ فرمانروا خاندان مالکی مذہب کا پیرو ہے۔

انگریزوں کی گرفت یہاں بہت سخت ہے۔ حکومت کی باگ ڈور انگریزوں کے ہاتھ میں ہے اور شیخ محض برائے نام ہے۔ کمپنی کی طرف سے جو رائلٹی انہیں ملتی ہے وہ اس میں مگن ہیں اور خوب دادِ عیش دے رہے ہیں۔ اس رائلٹی اور اس میں اضافہ کے سوا انہیں کسی چیز سے گویا دلچسپی نہیں ہے۔

شہریوں کو کسی قسم کی آزادی حاصل نہیں ہے۔ یہاں نہ صرف یہ کہ کوئی سیاسی پارٹی نہیں بنائی جاسکتی، بلکہ محدود معنوں میں مذہب کے لیے بھی اجتماعی طور پر کوئی کام نہیں کیا جا سکتا۔ جمعہ کے روز مساجد میں خطیب حضرات اس وقت تک کوئی خطبہ نہیں دے سکتے جب تک وہ اپنا خطبہ پہلے سے لکھ کر حکومت سے پاس نہ کرالیں۔ خفیہ پولیس کا نظام بہت ہی سخت ہے۔ کسی کی تقریر یا تحریر سے آزادی کی ذراسی بو بھی آتی ہے، اُسے یک لخت بحرین سے نکال باہر کیا جاتا ہے۔ اسی لیے ہر شخص دوسرے سے بات کرتا ہوا ڈرتا ہے۔ ہم نے دیکھا کہ جو لوگ ہم سے ہوٹل میں ملنے آیا کرتے تھے، وہ بھی اکٹھے ہو کر نہ ہمارے پاس آتے تھے اور نہ بازار میں چلتے تھے۔

یہاں سفید آبادی کے لیے عام آبادی سے دُور ایک الگ جگہ مقرر ہے جو یہاں کی سب سے اونچی جگہ ہے اور اسے عوالی کہا جاتا ہے۔

عرب قومیت کا فتنہ یہاں روز بروز پھیل رہا ہے اور اس کے زیر اثر غیر عرب مسلمانوں کے خلاف جتنا تعصب ہے، اتنا غیر مسلم عربوں کے خلاف نہیں ہے۔ پاکستانی مسلمانوں کی تعداد یہاں چند ہزار تک ہے، لیکن یہ تعداد عربوں کے تعصب کی وجہ سے دن بدن کم ہوتی جارہی ہے۔ عربوں کی طرف سے تیل کی کمپنی پر دباؤ ڈالا جارہا ہے کہ وہ غیر عرب سٹاف نہ رکھے اور جو غیر عرب سٹاف پہلے سے موجود ہے اُسے جلد سے جلد رخصت کرے۔ کہتے ہیں کہ پاکستانیوں کے خلاف اس تعصب کے پھیلانے میں مصری پراپیگنڈہ نے خاص طور پر کام کیا ہے۔

بحرین کی اصل زبان تو عربی ہے اور انگریزی اب سرکاری طور سے مسلط ہو گئی ہے۔ لیکن یہاں فارسی اور اردو بھی خوب بولی اور سمجھی جاتی ہیں، بلکہ ان دونوں زبانوں کے بہت سے الفاظ خود اہلِ بحرین اس طرح استعمال کرتے ہیں گویا وہ ان کی اپنی زبان کے الفاظ ہیں۔ راستہ، سیدھا، دروازہ، پنکھا، تازہ اور اس طرح کے کتنے ہی الفاظ ہیں جنھیں

اہل بحرین بلاتکلف استعمال کرتے ہیں ۔ "بند کرنے" کے لیے انہوں نے بَنَّدَ یُبَنِّدُ ایک نیا لفظ ایجاد کیا ہے، جسے یہ لوگ اپنا ہی لفظ سمجھتے ہوئے استعمال کرتے ہیں۔ صرف فارسی جاننے والے کو تو خیر کوئی دقت ہی نہیں۔ اگر کوئی صرف اردو جاننے والا آدمی بھی وہاں چلا جائے تو انشاء اللہ اسے اپنا کام چلانے میں کوئی دقت پیش نہیں آئے گی۔

بحرین میں ایک ایسی قبیح عادت کا ذکر سننے میں آیا جسے زبان پر لاتے ہوئے بھی شرم محسوس ہوتی ہے، لیکن اس کا ذکر کیے بغیر یہاں کے اجتماعی حالات کا صحیح اندازہ نہیں ہو سکتا تھا۔ غالباً اسلامی دنیا میں بحرین وہ واحد ریاست ہے جہاں بیسواؤں کی طرح لڑکوں کو بھی بدکاری کے لیے باقاعدہ حکومت کی طرف سے لائسنس دیا جاتا ہے۔ اس برائی کا علم اگرچہ چند سال پیشتر ایک فلسطینی دوست کے ذریعہ ہوا تھا، مگر یقین نہ آیا تھا۔ اب خود بحرین کے متعدد باشندوں کی زبان سے اس کی تصدیق ہو گئی۔ لاحول ولاقوۃ . . . .

(باقی)

سود کے متعلق چند اہم مباحث

ادارۂ ثقافتِ اسلامیہ کا سوالنامہ اور اس کا جواب

(۲)

دوسرا سوال لفظ ربٰو کے معنی لغتِ عرب میں تو زیادتی، اضافے اور بڑھوتری کے ہیں، لیکن "الربٰو" سے اصطلاحًا جو چیز مراد ہے وہ خود قرآن ہی کے اِن الفاظ سے صاف ظاہر ہو جاتی ہے:

وَذَرُوا مَا بَقِيَ مِنَ الرِّبٰوا... وَإِنْ تُبْتُمْ فَلَكُمْ رُءُوسُ أَمْوَالِكُمْ... وَإِنْ كَانَ ذُو عُسْرَةٍ فَنَظِرَةٌ إِلٰى مَيْسَرَةٍ۔ (۲: ۲۷۸-۲۸۰)

سود میں سے جو کچھ باقی رہ گیا ہے اسے چھوڑ دو... اور اگر تم توبہ کر لو تو تمہیں اپنے راس المال لینے کا حق ہے... اور اگر تمہارا دین دار تنگ دست ہو تو ہاتھ کھلنے تک اسے مہلت دو۔

یہ الفاظ اس بات پر دلالت کرتے ہیں کہ ربٰو کا یہ حکم قرض کے معاملہ سے متعلق ہے اور قرض میں اصل سے زائد جو کچھ طلب کیا جائے وہ الربٰو ہے جسے چھوڑ دینے کا حکم دیا گیا ہے۔ اس کے علاوہ قرآن یہ کہہ کر بھی ربٰو کا مفہوم واضح کرتا ہے کہ اَحَلَّ اللّٰهُ الْبَيْعَ وَحَرَّمَ الرِّبٰوا۔ (اللہ نے بیع کو حلال اور ربٰو کو حرام کیا ہے)۔ ان الفاظ سے ظاہر ہوتا ہے کہ ربٰو میں راس المال سے زائد جو کچھ لیا جاتا ہے وہ اس منافعہ سے مختلف ہے جو بیع کے معاملہ میں لاگت سے زائد حاصل ہوتا ہے۔ دوسرے الفاظ میں ربٰو مال کی وہ زیادتی ہے جو بیع کے طریقے سے نہ ہو۔ اسی بنا پر محدثین، فقہاء اور مفسرین کا پورا اتفاق ہے کہ قرآن میں وہ ربٰو حرام کیا گیا ہے جو قرض کے معاملہ میں اصل سے زائد طلب کیا جائے۔

نزولِ قرآن کے وقت یہ امر عرب میں پوری طرح معلوم و معروف تھا کہ قرض کا معاملہ

صرف شخصی حاجات ہی کے لیے نہیں ہوتا بلکہ کاروباری اور قومی اغراض کے لیے بھی ہوتا ہے لیکن اس کے باوجود قرآن نے نہ اس آیت میں، نہ کسی دوسری آیت میں، ایسا کوئی اشارہ کیا ہے جس سے یہ نتیجہ نکالا جا سکتا ہو کہ اغراض کے اعتبار سے قرض اور قرض میں کوئی فرق ہے اور سود کی حرمت کا یہ حکم صرف شخصی حاجات کے قرضوں کے لیے مخصوص ہے۔ فقہاء اسلام بھی پہلی صدی ہجری سے آج تک اس اصول پر متفق رہے ہیں کہ كُلُّ قَرْضٍ جَرَّ بِهٖ نفعًا فَهُوَ رِبٰو (ہر قرض جس کے ساتھ نفع حاصل کیا جائے، ربا ہے)۔ قریب کے زمانہ سے پہلے فقہاء کی اس متفقہ رائے سے اختلاف کی کوئی ایک مثال بھی تاریخ فقہ سے نکال کر پیش نہیں کی جا سکتی۔

تیسرا سوال | ربا اور ربح میں فرق یہ ہے کہ ربا قرض پر مال دے کر اصل سے زائد وصول کرنے کا نام ہے۔ اور اس کے برعکس ربح سے مراد بیع میں لاگت (COST PRICE) سے زائد قیمتِ فروخت حاصل کرنا ہے۔ اس کے مقابلہ میں خسارہ کا لفظ بولا جاتا ہے جبکہ لاگت سے کم پر کسی شخص کا مال فروخت ہو۔ لسان العرب میں ربح کے معنی یہ لکھے ہیں:

الرِّبْحُ والرَّبَحُ والرَّباحُ النماء فی التجر۔ ۔ والعرب تقول ربحت تجارته اذا ربح صاحبها فیها ۔ ۔ ۔ وقوله تعالٰی فَمَا رَبِحَتْ تِجَارَتُهُمْ [1]	تجارت میں افزونی کو ربح اور ربح اور رباح کہتے ہیں۔ ۔ عرب کہتے ہیں ربحت تجارته جبکہ تجارت کرنے والا نفع کماتے ۔ ۔ ۔ اور اللہ تعالٰی فرماتا ہے فما ربحت تجارتهم

مفردات امام راغب میں ہے:

الربح الزیادة الحاصلة فی المبایعة	ربح وہ زیادتی ہے جو خرید و فروخت کے معاملہ میں حاصل ہو۔

قرآن مجید خود بھی ربٰو اور تجارتی منافع کا فرق بیان کرتا ہے۔ کفار عرب حرمت سود کے خلاف جو اعتراض پیش کرتے تھے وہ یہ تھا کہ انما البیع مثل الربٰو۔ یعنی بیع میں اصل لاگت

[1] طبع بیروت، ج ۷، ص ۴۴۲۔

سے زائد جو قیمت فروخت وصول کی جاتی ہے وہ بھی تو آخر اسی طرح ہے جس طرح قرض کے معاملہ میں اصل راس المال سے زائد ایک رقم لی جاتی ہے۔ قرآن نے اس کے جواب میں صاف کہا کہ اَحَلَّ اللّٰہُ الْبَیْعَ وَحَرَّمَ الرِّبٰوا۔ "اللہ نے بیع کو حلال کیا اور ربا کو حرام کیا ہے" یعنی دولت میں اضافہ بصورت بیع اور چیز ہے اور بصورت قرض اور چیز۔ ایک کو خدا نے حلال کیا ہے اور دوسرے کو حرام۔ کوئی شخص منافع چاہتا ہو تو اس کے لیے یہ دروازہ کھلا ہے کہ خود بیع کا کاروبار کرے یا کسی دوسرے کے ساتھ اس میں شریک ہو جائے لیکن قرض دے کر منافع طلب کرنے کا دروازہ بند ہے۔

چوتھا سوال | ربا کی تعریف یہ ہے کہ "قرض کے معاملہ میں اصل سے زائد جو کچھ طلب کیا اور بطورِ شرطِ معاملہ دیا جائے وہ ربوا ہے"۔ اس تعریف میں اس سوال کا قطعاً کوئی دخل نہیں ہے کہ یہ ربا قرض دینے والے نے طلب کیا یا قرض لینے والے نے از خود پیش کیا۔ یہ سوال ربوا کی قانونی تعریف میں غیر موثر ہے اور قرآن سے یا کسی صحیح حدیث سے اس امر کا کوئی اشارۃً تک نہیں نکلتا کہ اگر سود قرض لینے والے کی طرف سے پیش کیا جائے تو اس سے اس کے سود ہونے اور حرام ہونے میں کوئی فرق واقع ہو گا۔ علاوہ بریں کوئی صاحبِ عقل دنیا میں ایسا موجود نہیں ہے نہ کبھی پایا گیا ہے جسے اگر سود کے بغیر قرض مل سکتا ہو تب بھی وہ سود ادا کرنے کی شرط اپنے طور پر پیش کرے۔ قرض لینے والے کی طرف سے یہ شرط تو اسی صورت میں پیش ہو سکتی ہے جبکہ کہیں سے اس کو بلا سود قرض ملنے کی امید نہ ہو۔ اس لیے سود کی تعریف میں اس کو غیر مؤثر ہونا ہی چاہیے۔

مزید براں بینکوں کی طرف سے قدیم زمانہ میں بھی اور آج بھی امانت رکھے ہوئے روپے پر سود اس لیے پیش کیا جاتا تھا اور کیا جاتا ہے کہ اس لالچ سے لوگ اپنی جمع شدہ دولت ان کے حوالہ کریں اور پھر وہ کم شرحِ سود پر لی ہوئی دولت آگے زیادہ شرحِ سود پر قرض دے کر فائدہ اٹھائیں۔ اس طرح کی پیشکش اگر سود دینے والے کی طرف سے ہوتی ہے تو حرمتِ سود کے مسئلے میں اس کے قابلِ لحاظ ہونے کی آخر کیا معقول وجہ ہے۔ امانتوں پر جو سود دیا جاتا ہے اس کی نوعیت دراصل یہ ہے کہ وہ اس سود کا ایک حصہ ہے جو انہی امانتوں کو شخصی، کاروباری اور ریاستی

قرضوں کی تشکیل میں دیکر وصول کیا جاتا ہے۔ یہ تو اسی طرح کا حصہ ہے جیسے کوئی شخص نقب زنی کے آلات کسی سے لے اور جو کچھ چوری کا مال اسے حاصل ہو اس کا ایک حصہ اس شخص کو بھی دے دے جس نے اسے یہ آلات فراہم کر کے دیے تھے۔ یہ حصہ اس دلیل سے جائز نہیں ہو سکتا کہ حصہ دینے والے نے بخوشی اسے دیا ہے، لینے والے نے جبر سے نہیں دیا ہے۔

پانچواں سوال | بیع سلم دراصل پیشگی سودے کی ایک صورت ہے یعنی ایک شخص دوسرے شخص سے آج ایک چیز خرید کر اس کی قیمت ادا کر دیتا ہے، اور ایک مدت مقرر کر دیتا ہے کہ بائع وہ چیز اس وقت خاص پر اسے دیگا۔ مثلاً میں ایک شخص سے کپڑے کے سو تھان آج خریدتا ہوں اور ان کی قیمت ادا کر دیتا ہوں اس شرط کے ساتھ کہ یہ تھان میں چار مہینے کے بعد اس سے لونگا۔ اس سودے میں چار باتیں ضروری ہیں۔ ایک یہ کہ مال کی قیمت سودا طے ہونے کے وقت ہی ادا کر دی جائے۔ دوسرے یہ کہ مال کی صفت (quality) واضح طور پر معین ہو تاکہ بائع اور مشتری کے درمیان اس کی صفت کے بارے میں کوئی چیز مبہم نہ رہے جو وجہ نزاع بن سکے۔ تیسرے یہ کہ مال کی مقدار بھی وزن، یا ناپ یا تعداد وغیرہ کے لحاظ سے ٹھیک ٹھیک معین ہو۔ اور چوتھے یہ کہ مال خریدار کے حوالہ کرنے کا وقت معین ہو اور اس میں بھی کوئی ابہام نہ ہو کہ وہ نزاع کا سبب بنے۔ اس سودے میں جو پیشگی قیمت دی جاتی ہے اس کی نوعیت ہرگز قرض کی نہیں ہے بلکہ وہ ویسی ہی قیمت ہے جیسی دست بدست بین دین میں خریدار ایک چیز کی قیمت ادا کرتا ہے۔ فقہ میں اس کا نام بھی ثمن ہے نہ کہ قرض۔ وقت معین پر مال کی عدم تحویل یا کسی اور سبب سے اگر بیع فسخ ہو جائے تو مشتری کو صرف اصل قیمت لوٹائی جاتی ہے۔ کسی شے زائد کا وہ حقدار نہیں ہوتا۔ اس میں اور عام بیع میں اس کے سوا کوئی فرق نہیں ہے کہ عام بیع میں مشتری بائع سے اپنی خریدی ہوئی چیز دست بدست لے لیتا ہے اور بیع سلم میں وہ اس کا قبضہ لینے کے لیے آئندہ کی ایک تاریخ مقرر کر دیتا ہے۔ اس معاملہ کو قرض اور سود کے مسئلے سے خلط ملط کرنے کی کوئی معقول وجہ میں نہیں سمجھ سکا۔ سوال میں جس کی جو مثال

بیان کی گئی ہے وہ بالکل غیر واضح ہے اور اس پر کوئی کلام ممکن نہیں۔ البتہ جس شکل میں یہ مثال بیان کی گئی ہے وہ دراصل شرکت کی شکل ہے یعنی بھینس ایک شخص کی اور اس پر کام دوسرا شخص کرے اور دودھ دونوں کے درمیان تقسیم ہو جاتے۔

چھٹا سوال | ہم جنس اشیاء کے دست بدست تبادلے میں تفاضل کو حرام قرار دینے کا مقصد جیسا کہ ابن قیم اور دوسرے لوگوں نے بیان کیا ہے، دراصل سدّ باب ذریعہ ہے یعنی اصل حرام تو ربوا النسیئہ (قرض کا سود) ہے۔ لیکن زیادہ ستانی کی ذہنیت کا قلع قمع کرنے کے لیے ہم جنس اشیاء کے دست بدست تبادلہ میں بھی تفاضل کو ممنوع قرار دے دیا گیا ہے۔ یہ امر ظاہر ہے کہ ایک ہی جنس کی اشیاء مثلاً چاول کا تبادلہ چاول سے صرف اسی صورت میں کیا جاتا ہے جبکہ اس کی ایک قسم بڑھیا ہو اور دوسری گھٹیا۔ شارع کا منشا یہ ہے کہ بڑھیا قسم کے ایک سیر چاول کا تبادلہ گھٹیا قسم کے مثلاً سوا سیر چاول سے نہ کیا جاتے، خواہ ان دونوں کی بازاری قیمت کا فرق اتنا ہی ہو۔ بلکہ ایک شخص اپنے چاول مثلاً روپے کے عوض فروخت کر دے اور دوسرے چاول روپے کے عوض ہی خرید لے۔ براہِ راست چاول کا چاول سے تفاضل کے ساتھ مبادلہ کرنے میں اس ذہنیت کو غذا ملتی ہے جو سود خواری کی اصل جڑ ہے اور شارع اسی کا خاتمہ کرنا چاہتا ہے۔ اس سلسلہ میں یہ امر قابلِ ذکر ہے کہ فقہائے دنیا سود کے مسئلے میں جتنے بھی اختلافات ہوتے ہیں وہ صرف ربوٰ الفضل کے معاملہ میں ہیں کیونکہ اس کی حرمت کے احکام نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے آخر زمانہ میں دیئے تھے اور آپ کی حیاتِ طیبہ میں معاملات پر ان احکام کے انطباق کی شکلیں پوری طرح واضح نہ ہو سکی تھیں لیکن جہاں تک ربوا النسیئہ (قرض کے معاملہ میں اصل سے زائد لینے) کا تعلق ہے، اس کی حرمت اور اس کے احکام میں فقہا کے درمیان پورا اتفاق ہے۔ یہ ایک صاف مسئلہ ہے جس میں کوئی الجھن نہیں ہے۔

ساتواں سوال | تجارت میں طرفین کی رضامندی ضرور لازم ہے، لیکن یہ نہ تجارت کے حلال ہونے کی علت ہے، نہ اس کا عدم سود کے حرام ہونے کی علت۔ قرآن میں کہیں یہ نہیں کہا گیا ہے کہ سود اس لیے حرام کیا جاتا ہے کہ دینے والا اسے بادلِ ناخواستہ مجبوراً دیتا ہے۔ اگرچہ دنیا میں کوئی

سود بھی برضا و رغبت نہیں دیا جاتا، اور بلا سود قرض ملنے کا امکان ہو تو کوئی شخص قرض پر سود نہ دے لیکن اس چیز کی حرمت کے مسئلے میں رضامندی اور نارضامندی کا سوال بالکل غیر متعلق ہے، کیونکہ قرآن مطلقاً اس قرض کو حرام قرار دیتا ہے جس میں راس المال سے زائد ادا کرنے کی شرط شامل ہو قطع نظر اس سے کہ یہ شرط تراضی طرفین سے طے ہوئی ہو یا کسی اور طرح۔

رہی یہ بحث کہ سودی قرض کی حرمت میں اصل علت ظلم ہے، اور جس قرض پر سود وصول کرنے میں ظلم نہ ہو وہ حلال ہونا چاہیے، اس کے متعلق میں یہ عرض کروں گا کہ قرآن نے اس امر کی کوئی گنجائش نہیں چھوڑی ہے کہ آپ اس کے الفاظ سے صرف "ظلم" کا علتِ حرمت ہونا نکال لیں اور پھر اس لفظ ظلم کا مفہوم خود جس طرح چاہیں مشخص کریں۔ قرآن جس جگہ یہ علتِ حرمت بیان کرتا ہے اسی جگہ وہ خود ہی ظلم کا مطلب بھی واضح کر دیتا ہے۔ اس کے الفاظ یہ ہیں:

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اتَّقُوا اللَّهَ وَ ذَرُوا مَا بَقِيَ مِنَ الرِّبَا إِن كُنتُم مُّؤْمِنِينَ ... وَإِن تُبْتُمْ فَلَكُمْ رُءُوسُ أَمْوَالِكُمْ لَا تَظْلِمُونَ وَلَا تُظْلَمُونَ۔ (۲: ۲۷۸ - ۲۷۹)	اے لوگو جو ایمان لاتے ہو اللہ سے ڈرو اور چھوڑ دو وہ سود جو لوگوں کے ذمہ باقی رہ گیا ہے اگر تم مومن ہو۔ ... اور اگر تم توبہ کر لو تو تمہیں اپنے راس المال لینے کا حق ہے۔ نہ تم ظلم کرو اور نہ تم پر ظلم کیا جائے۔

یہاں دو ظلموں کا ذکر کیا گیا ہے۔ ایک وہ جو دائن مدیون پر کرتا ہے۔ دوسرا وہ جو مدیون دائن پر کرتا ہے۔ مدیون کا دائن پر ظلم، جیسا کہ آیت کے سیاق و سباق سے صاف ظاہر ہوتا ہے، یہ ہے کہ اس کا دیا ہوا اصل راس المال بھی مدیون واپس نہ کرے۔ بالکل اسی طرح مدیون پر دائن کا ظلم جو اس آیت کے سیاق و سباق سے بین طور پر ظاہر ہو رہا ہے، یہ ہے کہ وہ اصل راس المال سے زائد اس سے طلب کرے۔ اس طرح قرآن یہاں اس ظلم کے معنی خود متعین کر دیتا ہے جو قرض کے معاملہ میں دائن و مدیون ایک دوسرے پر کرتے ہیں۔ اس معنی کے لحاظ سے انصاف یہ ہے کہ دائن مدیون سے صرف راس المال واپس لے، اور ظلم یہ کہ وہ راس المال سے زیادہ وصول کرے

قرآن کا یہ سیاق و سباق اپنے مفہوم میں اس قدر واضح ہے کہ ابن عباس اور ابن زید سے لیکر پچھلی صدی کے شوکانی اور آلوسی تک تمام مفسرین نے اس کا یہی مطلب لیا ہے۔ اس پوری مدت میں کوئی ایک مفسر بھی ایسا نہیں پایا جاتا جس نے قرآن سے صرف ظلم کا لفظ حرمتِ ربوا کی علت کے طور پر نکال لیا ہو اور پھر ظلم کے معنی باہر کہیں سے لینے کی کوشش کی ہو۔ یہ بات اصولاً بالکل غلط ہے کہ ایک عبارت کے اپنے سیاق و سباق سے اس کے کسی لفظ کا جو مفہوم ظاہر ہوتا ہو اسے نظر انداز کر کے ہم اپنی طرف سے کوئی معنی اس کے اندر داخل کریں۔

اس سوال کے سلسلے میں یہ دعویٰ جو کیا گیا ہے کہ کمرشل انٹرسٹ میں کسی پارٹی پر بھی ظلم نہیں ہوتا، یہ بھی ہمیں تسلیم نہیں ہے۔ کیا یہ ظلم کچھ کم ہے کہ ایک شخص قرض پر سرمایہ دیکر تو ایک خاص منافعہ کی ضمانت حاصل کرلے، مگر جو لوگ کاروبار کو پروان چڑھانے کے لیے وقت محنت اور ذہانت صرف کریں ان کے لیے سرے سے کسی منافعہ کی کوئی ضمانت نہ ہو، بلکہ نقصان ہونے کی صورت میں بھی وہ دائن کو اصل مع سود دینے کے ذمہ دار رہیں؟ تمام خطرہ (RISK) محنت اور کام کرنے والے فریق کے حصے میں، اور خالص منافعہ روپیہ دینے والے فریق کے حصہ میں، یہ آخر انصاف کیسے ہو سکتا ہے۔ اس لیے سود بہر حال ظلم ہے، خواہ وہ شخصی حاجات کے قرضوں میں ہو یا کاروباری اغراض کے قرضوں میں۔ انصاف چاہتا ہے کہ اگر آپ قرض دیتے ہیں تو آپ کو صرف اپنا راس المال واپس ملنے کی ضمانت حاصل ہو، اور اگر آپ کاروبار میں روپیہ لگانا چاہتے ہیں تو پھر شریک کی حیثیت سے روپیہ لگائیے۔

آٹھواں سوال اس سوال کا تفصیلی جواب میں اپنی کتاب "سود" میں دے چکا ہوں۔ یہاں مختصر جواب عرض کرتا ہوں۔

(الف) صنعتی اداروں کے معمولی حصے بالکل جائز ہیں بشرطیکہ ان کا کاروبار بجائے خود حرام نوعیت کا نہ ہو۔

(ب) ترجیحی حصص، جن میں ایک خاص منافعہ کی ضمانت ہو، سود کی تعریف میں آتے ہیں اور ناجائز ہیں۔

(ج) بینکوں کے فکسڈ ڈپازٹ کے متعلق دو صورتیں اختیار کی جا سکتی ہیں:

جو لوگ صرف اپنے روپے کی حفاظت چاہتے ہوں اور اپنا روپیہ کسی کاروبار میں لگانے کے

خواہشمند نہ ہوں، ان کے روپے کو بینک "امانت" رکھنے کے بجائے "قرض" لیں، اسے کاروبار میں لگا کر منافعہ حاصل کریں، اور ان کا اصل راس المال مدت مقررہ پر ادا کر دینے کی ضمانت دیں۔

اور جو لوگ اپنے روپے کو بینک کی معرفت کاروبار میں لگوانا چاہیں، ان کا روپیہ "امانت" رکھنے کے بجائے بینک ان سے ایک عام شراکت نامہ طے کرے، ایسے تمام اموال کو مختلف قسم کے تجارتی، صنعتی، زراعتی یا دوسرے کاموں میں، جو بینک کے دائرہ عمل میں آتے ہوں، لگائے، اور اس مجموعی کاروبار سے جو منافعہ حاصل ہو، اسے ایک طے شدہ نسبت کے ساتھ ان لوگوں میں اسی طرح تقسیم کرے جس طرح خود بینک کے حصہ داروں میں منافعہ تقسیم ہوتا ہے۔

(د) بینکوں سے لیٹر آف کریڈٹ کھلوانے کی مختلف صورتیں ہیں جن کی شرعی پوزیشن جداگانہ ہے۔ جہاں بینک کو محض ایک اعتماد نامہ دینا ہو کہ یہ شخص بھروسے کے قابل ہے، وہاں بینک جائز طور پر صرف اپنے دفتری اخراجات کی فیس لے سکتا ہے۔ اور جہاں بینک دوسرے فریق کو رقم ادا کرنے کی ذمہ داری لے، وہاں اسے سُود نہیں لگانا چاہیے۔ اس کے بجائے مختلف جائز طریقے اختیار کیے جا سکتے ہیں۔ مثلاً بینکوں کے کرنٹ اکاؤنٹ میں کاروباری لوگوں کی جو رقمیں رہتی ہیں، ان پر کوئی سود نہ دیا جائے بلکہ حساب کتاب رکھنے کی اُجرت لی جائے، اور ان رقموں کو قلیل المیعاد قرضوں کی صورت میں کاروباری لوگوں کو بلا سُود دیا جائے۔ ایسے قرض داروں سے بینک اس رقم کا سود تو نہ لیں، البتہ اپنے دفتری اخراجات کی فیس ان سے لے سکتے ہیں۔

(ھ) حکومت خود، یا اپنے زیر اثر جتنے ادارے بھی قائم کرے ان سے سُود کے عنصر کو خارج ہونا چاہیے۔ اس کے بجائے دوسرے طریقے تھوڑی توجہ اور قوت اجتہاد سے کام لیکر نکالے جا سکتے ہیں جو جائز بھی ہوں اور نفع بخش بھی۔ اس طرح کے تمام اداروں کے بارے میں کوئی ایک جامع گفتگو چند الفاظ میں یہاں نہیں کی جا سکتی۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ پہلے حرام چیز کو حرام مان لیا جائے۔ پھر اس سے بچنے کا ارادہ ہو۔ اس کے بعد ہر کارپوریشن کے لیے ایک ایسی کمیٹی بنائی جائے جو اس کارپوریشن کے تمام کاموں کو نگاہ میں رکھ کر یہ دیکھے کہ اس کے مختلف کام کہاں کہاں حرام طریقوں سے ملوث ہوتے ہیں اور ان کا بدل کیا ہے جو اسلامی

احکام کی رو سے جائز بھی ہو اور قابلِ عمل اور نفع بخش بھی۔ اولین چیز ہماری اس ذہنیت کی تبدیلی ہے کہ اہلِ مغرب کے جن پٹے ہوئے راستوں پر چلنے کے ہم پہلے سے عادی چلے آ رہے ہیں انہی پر ہم آنکھیں بند کر کے چلتے رہنا چاہتے ہیں، اور سارا زور اس بات پر صرف کر ڈالتے ہیں کہ کسی طرح انہی راستوں کو ہمارے لیے جائز کر دیا جائے۔ ہماری سہولت پسندی ہمیں اس بات کی اجازت نہیں دیتی کہ ہم کچھ دماغ سوزی اور کچھ محنت کر کے کوئی نیا راستہ نکالیں۔ تقلیدِ جامد کی بیماری بدقسمتی سے ساری قوم کو لگی ہوئی ہے۔ نہ جبہ پوش اس سے شفا پائے ہیں نہ سوٹ پوش۔

(و) گورنمنٹ کے قرضے جہاں تک اپنے ملک سے حاصل کیے جائیں ان پر سود نہ دیا جائے۔ اس کے بجائے حکومت اپنے ایسے منصوبوں کو جن میں قرض کا روپیہ لگایا جاتا ہے کاروباری اصول پر منظم کرے اور ان سے جو نفع حاصل ہو اس میں سے ایک طے شدہ تناسب کے ساتھ ان لوگوں کو حصہ دیتی رہے جن کا روپیہ وہ استعمال کرتی ہے۔ پھر جب وہ مدت ختم ہو جائے جس کے لیے ان سے روپیہ مانگا گیا تھا اور ان لوگوں کا راس المال واپس کر دیا جائے تو آپ سے آپ منافع میں ان کی حصہ داری بھی ختم ہو جائیگی۔ اس صورت میں درحقیقت کوئی بہت بڑا تغیر کرنا نہیں ہوگا۔ متعین شرحِ سود پر جو قرض لیے جاتے ہیں، ان کو تبدیل کر کے بس متناسب منافع پر حصہ داری کی صورت دینی ہوگی۔

غیر ملکوں سے جو قرض لیے جاتے ہیں ان کا مسئلہ اچھا خاصا پیچیدہ ہے۔ جب تک پوری تفصیل کے ساتھ ایسے تمام قرضوں کا جائزہ نہ لیا جائے، یہ نہیں کہا جا سکتا کہ ان کی نوعیتیں کیا کیا ہیں اور ان کے معاملہ میں حرمت سے بچنے کے لیے کس حد تک کیا کچھ کیا جا سکتا ہے۔ البتہ اصولی طور پر جو بات میں کہہ سکتا ہوں وہ یہ ہے کہ ہمیں پہلے اپنی تمام توجہ اندرونِ ملک سے سود کو ختم کرنے پر صرف کرنی چاہیے اور بیرونِ ملک میں جہاں سودی لین دین سے بچاؤ کی کوئی صورت نہ ہو وہاں اس وقت تک اس آفت کو برداشت کرنا چاہیے جب تک اس سے بچنے کی صورتیں نہ نکل آئیں۔ ہم اپنے اختیار کی حد تک خدا کے سامنے جواب دہ ہیں۔ اس حد تک اگر ہم گناہ سے بچیں تو مجبوری کے معاملہ میں ہم معافی کی امید رکھ سکتے ہیں۔

خـــالی صفحـــه